



تحریک آزادی اردو

اور مسلم ادب

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)

ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی



راجستھان وقف بورڈ ہے پور (راجستھان)



تحریک آزادی اردو

اور مسلم ادب

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)

ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی



راجستھان وقف بورڈ جے پور (راجستھان)

راجستھان وقف بورڈ، جے پور (راجستھان)



نام کتاب _____ تحریک آزادی اردو نثر اور مسلم ادب
مصنف _____ ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی
سن اشاعت _____ ۱۹۹۷ء
خوش نویس _____ محمد سفیان نعمانی جے پور
مطبع _____ گلبرگ پریس، دہلی

ناشر

راجستھان وقف بورڈ، جے پور (راجستھان)

TEHRIK E AZADI, URDU NASR AUR MUSLIM UDEBA

(To Commemorate the 50th year of India's independence)

BY

DR. ZIA UR REHMAN SIDDIQUI
M.A. Ph.D

Lecturer, Urdu Teaching and Research Centre Govt. of India
Solari - H.P.

Published by :

RAJASTHAN WAQF BOARD, JAIPUR

(انتساب)

!

محترم احترام اللہ صاحب کی ذمہ !
جن کی شخصیت اس کتاب کی اشاعت کے
لئے محرکِ اول ثابت ہوئی۔

دِظْهَارِ شُكْرِ

محرم شُکُوتِ انصاری صاحبِ چیرمین راجستھان وقف بورڈ، جسے پور کا شکر یہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہوں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر راجستھان وقف بورڈ کی جانب سے کتاب کو شائع کرنے کی اجازت دی نیز اپنی عظیم الفرستی کے باوجود مفید مشوروں سے نوازا، انہیں کی رہنمائی اور سرکردگی میں یہ دشوار گزار کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

جناب احرام اللہ صاحب سیکریٹری راجستھان وقف بورڈ کا مہم قلب سے مشکور ہوں جنہوں نے اپنی علمی و منصبی مصروفیتوں کے باوجود کتاب کی اشاعت کے ہر مرحلے کی تکمیل میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ زیر نظر کتاب کی اشاعت دراصل انہیں کی شفقتوں کا نتیجہ ہے۔

راجستھان وقف بورڈ کے تمام کارکنان کا ممنون ہوں جنہوں نے اشاعت کے سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔

ضیاء الرحمن صدیقی

کتب کو بنا کسی مالی فائدے
کے (مفت) پی ڈی ایف کی
شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے

حسنین سیالوی

0305-6406067



بھلوں کو بھلی لاج

ترتیب

7	حرفِ اول
12	بابِ اول: ———
	تحریکِ آزادی کا تاریخی پس منظر
31	بابِ دوم: ———
	تحریکِ آزادی کا سفر۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے آزادی ہند تک
49	بابِ سوم: ———
	تحریکِ آزادی اور اردو ناول
68	بابِ چہارم: ———
	تحریکِ آزادی اور اردو افسانہ
88	بابِ پنجم: ———
	تحریکِ آزادی اور اردو ڈرامہ
97	بابِ ششم: ———
	تحریکِ آزادی اور اردو طنز و مزاح
137	بابِ ہفتم: ———
	تحریکِ آزادی اور اردو خودنوشت و سوانح
115	بابِ ہشتم: ———
	تحریکِ آزادی اور اردو صحافت

حرفِ اول

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پوری طرح برطانوی سامراج کے شکنجے میں آگیا۔ غیر ملکی نوآبادیاتی حکومت نے معاشی استحصال کے علاوہ بھی ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔ مغربی تہذیب کے سیلاب میں ہندوستانیوں کی صدیوں سے پرورش یافتہ تہذیبی، سماجی اور اخلاقی قدریں بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور پوری ایک صدی قدیم و جدید کی کشمکش میں گزری جس کا انجام مغربی صنعتی تہذیب کے غلبہ و اقتدار کی شکل میں رونما ہوا۔

انگریزوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لئے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت کا شعور بھی تھا، جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کے ساتھ جنگ آزادی میں تیزی اور مجاہدگی پیدا ہو گئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کا مقصد ارادہ کر لیا۔

تحریک آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اردو زبان و ادب نے عموماً اور اردو شاعرانہ خصوصاً ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا اور آزادی کی تحریکات میں ایک نئی روح پھونکی۔

زیر نظر کتاب "تحریک آزادی اور اردو شاعرانہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ پر پسلی ہوئی ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب تحریک آزادی کے تاریخی اور سیاسی پس منظر پر محیط ہے۔ اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگریز ہندوستان میں کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں داخل ہوئے اور انہوں نے کس طرح ملکہ الزبتھ کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں قائم کر کے مستحکم بنایا۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ اور کلایو کے مابین پلاسی کے میدان میں زبردست معرکہ ہوا۔ انگریزوں

کے قریب کارانہ روتے نیز نواب کے سپہ سالار کی سازش سے سراج الدولہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

زیر نظر باب میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے ان محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو انگریزوں سے ہندوستانی عوام اور سپاہ کی نفرت کا باعث بنے اور بالآخر انہوں نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس ضمن میں انقلاب کی تفصیلات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس باب میں اس کے نتائج و اثرات بھی وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں پر انگریزوں کے نوبہ نومظالم کی داستان بیان کی گئی ہے نیز ان مظالم کے خلاف ہندوستانیوں کے رد عمل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض کہ ان تمام عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ہندوستانیوں کے دلوں میں تحریک آزادی کا بیج بوئے اور اس کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

باب دوم میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے آزادی ہند (۱۹۴۷ء) تک جدوجہد آزادی کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کے بعض اہم اجلاسوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں میں منعقد ہوئے۔ اس باب میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کیوں قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور آگے چل کر اس نے کیا صورت اختیار کی۔ اسی کے ساتھ اس باب میں ان تمام تحریکات اور حالات و واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو جدوجہد آزادی کے سلسلے میں عمل پذیر ہوئے اور جن کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی عوام کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریک آزادی کے اس تاریخی، سیاسی پس منظر کے بیان کے بعد تیسرے باب کے کتاب کا اصل حقد یعنی اردو نشر کی روشنی میں تحریک آزادی کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں نشر کی مختلف اصناف و اقسام میں تحریک آزادی کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس عظیم تحریک کے فروغ میں مختلف اصناف نیز مسلمانوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ جو بھی

حصہ رہا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب اردو ناول سے متعلق ہے۔ اس باب میں ڈپٹی نذیر احمد سے لیکر آزادی ہند تک اُن ناول نگاروں کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر تحریک آزادی کے فروغ کی مساعی یا جدوجہد آزادی کے آثار نظر آتے ہیں اس سلسلے میں بالخصوص پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر، عزیز احمد، وغیرہ کے ناولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب چہارم میں تحریک آزادی کا مطالعہ اردو افسانوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس باب میں پریم چند کی گاندھی جی سے عقیدت اور تحریک آزادی سے ذہنی و عملی وابستگی نیز اپنے افسانوں کے ذریعے اس کے اظہار کی بدولت خصوصی مطالعہ کے مستحق قرار پائے ہیں۔ پریم چند کے علاوہ اس خصوص میں جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات زیر بحث آئی ہیں ان میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد علی شامل ہیں۔ متعلقہ افسانہ نگاروں کی نگارشات کا جائزہ لیکر یہ حقیقت آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ افسانہ نے اپنے محدود کینوس کے باوجود آزادی سے متعلق جذبات و احساسات کو اپنے اندر سمونے میں کوتاہ مینی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

پانچواں باب ڈرامہ سے متعلق ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اس باب میں صرف انہیں ڈراموں کو زیر بحث لایا گیا ہے جو خالصتاً سیاسی تھے اور جن میں کسی بھی عنوان سے تحریک آزادی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں یا اس سے وابستگی اور اسے فروغ دینے کی کوششوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت، تانا صاحب، امراؤ علی کا ڈرامہ البرٹ بل، مولانا ظفر علی خاں صاحب کا ڈرامہ جنگ روس و جاپان، اصغر علی نظامی کا ڈرامہ "قوی دلبر" عبداللطیف شاہ کا ڈرامہ "ہمارا گھر" محشر انبالوی کا ڈرامہ "غریب ہندوستان" ریاض دہلوی کا ڈرامہ "مسلم پجاری" نیر انبالوی کا "وطن" دل کھنوی کا "تاج محل" اور شہید وطن شمس لکھنوی کے ڈرامے "مادرِ وطن" اور حب الوطن، محمد دین تاثیر کا ڈرامہ "لیلائے وطن" عاجز ناگیری کا "پیام حق" محی الدین عزم کا ڈرامہ "دیس

کی پکار۔ اظہر دہلوی کا ڈرامہ ”بیداری“ محمد مجیب کا ڈرامہ ”آزمائش“ شامل ہیں۔

باب ششم میں طنز و مزاح کے تعلق سے تحریک آزادی کے تخلیقی اظہار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ طنز و مزاح کے پس منظر اور آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے منشی سجاد حسین کے مضامین اور سیاسی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ نیز ”اودھ پنچ“ کے قلم کاروں کی تخلیقات اور دیگر تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض ایسے مضامین سے بحث کی گئی ہے جن میں مزاح کے پیرائے میں حکومت وقت کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں سجاد حسین کے بعض اہم طنزیہ و مزاحیہ خطوط زیر بحث آئے ہیں جو انہوں نے اس دور کے سیاسی تناظر میں حکام کو تحریر کئے تھے۔

”اودھ پنچ“ کے بعد سے آزادی ہند تک جن اہل قلم کے یہاں خالصتاً یا ضمناً طنز و مزاح کے پیرائے میں تحریک آزادی سے متعلق اظہار خیال ملتا ہے، اس باب میں ان سب کی متعلقہ تحریروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ہفتم میں خود نوشت سوانح اور سوانح عمری میں تحریک آزادی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ خود نوشت سوانح عمریوں سے متعلق ہے، دوسرے حصہ میں سوانح عمریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں صرف انہیں سوانح عمریوں اور خود نوشت سوانح کا جائزہ لیا گیا ہے جو سیاسی نوعیت کی ہیں اور جن سے بالواسطہ یا براہ راست تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

موضوع کی مناسبت سے اس باب میں جن خود نوشت سوانح عمریوں کو شامل کیا گیا ان میں جعفر تھانیسری کی ”تواریخ عجیب“ ظہیر دہلوی کی ”داستانِ غدر“ سید رضا علی کی ”اعمال نامہ“ افضل حق چودھری کی ”میرا افسانہ“ نواب احمد سعید خاں چغتاری کی ”یادِ ایام“ عبد المجید سالک کی ”سرگزشت“ عبد اللطیف بٹالوی کی ”لطیف کی کہانی“ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک سوانح عمریوں کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض اہم سوانح عمریوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور بعض کی صرف نشاندہی کر دی گئی ہے۔

باب ہشتم اردو صحافت پر مشتمل ہے۔ اس میں شہید سے آزادی ہند تک کے ان

اخبارات اور رسائل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے جن کا مطلع نظر خائننا سیاسی تھا۔ یہ باب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا باب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۷ء تک کی مصافت کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں بیسویں صدی کے اوائل سے حصول آزادی ہند تک کے اخبارات اور رسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان رسالوں اور اخبارات کے مدیروں نے براہ راست برطانوی حکومت کی تاننا فیوں اور مظالم کے خلاف لکھا اور اپنی تحریروں کے ذریعے عوام میں آزادی کا جذبہ اور قومی شعور پیدا کیا۔ اور اس طرح آزادی کی مختلف تحریکات کو عوام تک پہنچانے میں ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ان اردو رسائل و اخبارات کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان نے مدیروں کو طرح طرح کی سخت سزائیں سہنے کے باوجود آخر تک اپنے وطن عزیز اور اس کے متعین نصب العین کی خاطر بیباک اور نڈر ہو کر لکھتے رہے۔

اس وسیع موضوع پر کھڑے اور پھیلے ہوئے کام کو ایک مقالے میں جس کی بہ حال کچھ حدود ہوتی ہیں سمیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی خاکسار نے کوشش کی ہے کہ موضوع سے متعلق تمام ضروری مواد اور مطالعے کی مختلف جہات کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سے تحریک آزادی اور اردو شکر کے تعلق کو سمجھنے نیز مسلم مجاہدین کے کارناموں کو جاننے میں مدد ملے گی۔

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں مختلف مقاصد کے پیش نظر جن کتب خانوں سے استفادہ کیا موقع ملا ان میں مادر در سگاہ ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے علاوہ سنٹرل لائبریری دہلی یونیورسٹی، گاندھی میوزم اینڈ لائبریری نئی دہلی، نند و میوزیم اینڈ لائبریری نئی دہلی، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی، ہریال میوزیم لائبریری دہلی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، وغیرہ شامل ہیں۔ ان لائبریریوں کے کارکنان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ضیاء الرحمن صدیقی

لیکچرر اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر حکومت ہند
مولن، بہاجپور، ہریانہ

تحریک آزادی ہند

کا

تاریخی پس منظر

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسی حد فاصل تسلیم کی جاتی ہے جہاں ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز۔ آزادی کی یہ جنگ ایک تاریخی جنگ تھی جو کسی فوری منصوبے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی تیاریوں کا سلسلہ "جنگ پانچویں" اور میسور کی جنگوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چرل والے کارٹوس آزادی کی اس جنگ کے لئے بہانہ بن گئے اور ۱۸۵۷ء میں اس نے شدت اختیار کر لی۔ تحریک آزادی ہند کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کا ذکر بھی ناگزیر ہے کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خشتِ اول رکھی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل انگلستان میں یکم دسمبر ۱۶۰۰ء کو ہوئی تھی۔ لندن کے چند انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل کی تھی جس کا مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا۔ اس کمپنی کو ملکہ ایلزبتھ کے ایک چارٹر کی رو سے ہندوستان میں پندرہ سال کے لئے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ فرمان ایلزبتھ چارٹر ELIZABETH CHARTER کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ملکہ ایلزبتھ کے بعد جیس اول انگلستان میں تخت نشین ہوا اس نے بھی کمپنی کے امور اور مسائل میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۶۰۹ء کو جیس اول کے ایک فرمان کی رو سے کمپنی کو مشرقی تجارت میں "دوامی اجارہ داری" PERMANENT SETTLEMENT کے حقوق مل گئے۔ اس فرمان کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ انگلستان کا کوئی بھی تاجر مشرقی مالک کے ساتھ ذاتی طور پر تجارتی تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۶۰۹ء میں جیس اول نے سرطاس رو کو اپنا سفیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔ سرطاس رو جب ہندوستان آیا وہ جہانگیر کا عہد تھا۔ لوگ آسودہ حال تھے، انگریزی سفیر سرطاس رو نے مغل دربار تک رسائی حاصل کی اور شہنشاہ سے اچھے مراسم قائم کر لئے۔ اس طرح کمپنی کو دربارِ جہانگیری سے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے

اس موقع کو غنیمت جان، انہوں نے اپنی تجارت کے استحکام کے فروغ کے لئے سورت میں ایک فیکٹری قائم کی۔ اس فیکٹری کے چاروں جانب فصیل بنوائی۔ جہانگیر کے عہد میں آگرہ، امیر، احمد آباد، بہرائچ میں بھی انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ ہمیں اول کے بعد چارلس اول انگلستان میں تخت نشین ہوا۔ چارلس اول کے عہد میں انگلستان کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چارلس اول کے قتل کے بعد گرامویل انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے دورِ حکومت میں صنعتی اعتبار سے انگلستان کو فروغ ملا۔ گرامویل کے بعد جلد ہی چارلس اول کا بیٹا چارلس دوم انگلستان کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں سے جائز و ناجائز ہر طرح سے روپیہ بٹورنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستانیوں پر طرح طرح سے زیادتی بھی کی گئیں۔ اورنگ زیب نے ان زیادتیوں کا سدباب کیا اور متعلقہ افراد کو سزائیں دیں۔ کمپنی نے عالمگیر سے اپنے افعال کی معافی چاہی اور مصالحت کر لی۔ لہذا اورنگ زیب کے ایک فرمان کی رو سے کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "تلاشِ ہند" میں لکھا ہے:

"ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بڑا مقصد جس کے لئے وہ قائم ہوئی تھی یہ تھا کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں خصوصاً یہاں کا کپڑا وغیرہ اور مختلف قسم کے مسالے مشرق سے لے جائے جہاں ان کی بے حد مانگ اور کھپت تھی۔"

انگریز ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے انہوں نے اپنے مقبوضات کو بڑھانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ سیاسی امور میں دخل ہونے لگے۔ ہندوستانی تجارت پر انگریز اور ولندیزی DUTCH قابض تھے۔ ادھر فرانسیسی بھی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے لگے۔ انہوں نے بہت جلد پانڈیچری، چندرنگر، ماہی، کاریگل اور چند دیگر بندرگاہوں پر کوٹھیاں قائم کر لیں۔

باری علیگ اپنی کتاب "کمپنی کی حکومت" میں لکھتے ہیں :-
 "اٹھارھویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سیاسی اور معاشی مفاد ایک دوسرے ٹکرائے تو دوسری جنگوں کے علاوہ ہندوستان میں

بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے۔ ان لڑائیوں کا آغاز کرنا کم میں ہوا۔ تین لڑائیاں ہندوستان کی تاریخ میں اس لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں کہ ان لڑائیوں نے جہاں ہندوستان میں فرانسیسیوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کر دیا وہاں ان لڑائیوں نے انگریزوں کے لئے مشرق میں ملک گیری کے دروازے کھول دیئے۔
پنڈت جواہر لال نہرو "تلاشِ ہند" میں انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحکام کا اجمالی خاکہ اس طرح پیش کرتے ہیں :-

"سترھویں صدی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغل شہنشاہ کی طرف سے سورت میں تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت مل گئی اور چند سال بعد انہوں نے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا اور مدراس کی بنیاد ڈالی گئی ۱۶۳۹ء میں جزیرہ بمبئی چالیس دوم کو پرتگالیوں کی طرف سے بطور حبسینہ ملا تھا اور اس نے اس کو کمپنی کے نام منتقل کر دیا۔ ۱۶۹۰ء میں شہر کلکتہ کی بنیاد رکھی اس طرح سترھویں صدی کے آخر تک برطانیہ نے ہندوستان میں کئی جگہ ساحل بحر پر قدم جما لئے اور آہستہ آہستہ اندر کی طرف بڑھے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں ایک وسیع رقبہ زمین پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ آیا اور چند ہی سال میں بنگال، بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ پھر ایک بہت بڑا قدم تقریباً چالیس برس بعد انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا گیا اور وہ دہلی تک جا پہنچے۔ تیسرا اہم قدم ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کے آخری شکست کے بعد ہوا اور چوتھا قدم ۱۸۲۹ء میں جب سکھوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور برطانوی ہند کا نقشہ مکمل ہو گیا تھا۔"

بنگال کے نواب علی وردی خاں نے اپنے بعد اپنے نواسے سراج الدولہ کو **جنگِ پلاسی** بنگال کا نواب مقرر کیا تھا۔ علی وردی خاں انگریزوں کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھا اور انگریزوں کی حکمتِ ملی کو سمجھتا تھا۔ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینا

چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفات کی، مرنے سے قبل اس نے اپنے جانشین سراج الدولہ کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی :-

”مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہے اگر میری عمر کا بیانا لبریر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس اندیشہ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا۔ اس کام کی تکمیل تیرے ذمہ ہے۔“

”میرے چراغ ؛ دکن میں ان کی سرگرمیوں سے سبق حاصل کرو، ذاتی جنگوں میں الجھ کر انہوں نے اکبر اعظم کی رعایا کے اموال و املاک پر قبضہ جما لیا ہے۔ ایک وقت میں تینوں قوتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے انگریزوں کے قوت کو توڑنا۔۔۔۔۔ سنو بیٹا ؛ انہیں سپاہی رکھنے اور قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں ہے۔“

۱۹ اپریل ۱۷۵۷ء کو علی وردی خان کی وفات کے بعد سراج الدولہ بنگال کا نواب مراد انگریزوں نے اس کی مخالفت کی اور رسم کے مطابق تذر نہیں پیش کی۔ انگریزوں کے اس رویے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز سراج الدولہ کی تخت نشینی سے خوش نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ نواب کے خلاف فریب کاریوں اور ریشہ دوانیوں کے جال پھیلانے میں متہم ہو گئے۔ انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ کی مرمت کرانی شروع کر دی۔ مزید برآں نواب کے مخالفین کرشن داس وغیرہ کو اپنے ہاں پناہ دی۔ کرشن داس ڈھاکہ کے دیوان راجہ بلب کا بیٹا تھا۔ جو انگریزوں کے لئے فائدہ مند تھا۔ ان حالات نے سراج الدولہ کو انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیا اور اس نے فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا مصمم عزم کر لیا۔

چنانچہ ایک انگریز مورخ جی۔ ایس۔ بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

”سراج الدولہ کا انگریزوں پر حملہ حق بجانب تھا۔“

زین لانے اپنی یادداشت میں لکھا ہے :-

”انگریزوں نے دربار سراج الدولہ سے تمام تعلقات منقطع کر لئے ہیں، بار بار انہوں نے

سراج الدولہ کو قاسم بازار کی فیکٹری میں جانے سے روکا گیا۔

کلائیو اور سراج الدولہ کی فوجیں ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں اتر آئیں۔ ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو زبردست معرکہ ہوا جس میں اپنے ہی کچھ جرنیلوں کی غداری کی بدولت سراج الدولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور بارہ خوجان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میر جعفر، درویش ام، جگت سنگھ اور یار لطف خان وغیرہ نے کلہو سے مل کر نواب کے ساتھ غداری کی لیکن میر میدان اور موہن لال نے انگریزوں کا جھکومتنا بلکہ کیا۔ میر میدان زخمی ہو کر گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ میر میدان کی موت سے نواب دل شکستہ ہو گیا۔ ادھر میر جعفر کے میم اصرار پر سراج الدولہ نے موہن لال کو بھی میدان سے واپس بلالیا۔ نواب کی فوج منتشر ہو گئی اور اس طرت فوج میں تباہی پڑ گئی۔ جنگ کے بعد سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ میر جعفر کی حراست میں رہا۔ رات کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔ سراج الدولہ کی شہادت پر رام نرائن موزوں نے اس سے اپنے تعلق خاطر کو اس شعر کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مگیا آحسہ کو دیر اسے پہ کیا گذری

پلاسی کی اس فیصلہ کن جنگ نے انگریزوں کے ہندوستان میں پیر جما دیئے۔ اس جنگ میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کے شعلے بھڑکتے رہے اور وہ پلاسی کے میدان میں اس تاریخی جنگ کی یاد تازہ کرتے رہے۔ ہندوستان کے غیور فرزندوں کے دلوں میں اپنے ملک کی محبت کا جذبہ بیدار رہا۔ جنگ کے سوساں بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں وہ یہ کہہ کر میدان میں اتر آئے: ”آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے“ جنگ پلاسی میں ہندوستانیوں کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کلائیو نے اپنی سازشوں سے نواب کے خاص سپہ سالاروں میں پھوٹ ڈال دی تھی۔ کلائیو اپنی زبان پر قائم نہ رہا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ کمپنی کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے کیا۔

انگریز اپنی سازشوں میں کامیاب ہو گئے اور سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا۔ سراج الدولہ

کے قتل کے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
حیدر علی انگریزوں کے خلاف آخر تک لڑتا رہا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح
ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ وہ ایک ذی شعور، جری، متجسس اور دامتد انسان تھا۔ اس نے کہا
تھا: "ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے۔"

"تاریخ سلطنت خداداد" کا مصنف محمود بنگلوری رقمطراز ہیں۔

"وہ (ٹیپو سلطان، انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ سلطان
ہندوستانیوں کو ایک مرکز پر لانے کی کافی جدوجہد کی۔ اس سے ایسٹ انڈیا
کمپنی مخالف ہو گئی۔ وہ تمام عمر انگریزوں سے جنگ کرتا رہا۔"

سرجان ایلس شرو تھرو اس وقت کلکتہ کا چیف جسٹس تھا۔ ٹیپو سلطان کی موت پر پتی
خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"ٹیپو کی طاقت ہی ہماری فوجوں کو شکست دینے کے لئے کافی تھی اس
کے مرتے ہی ہندوستان میں ہمارا (انگریزوں کا) قبضہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔"

ٹیپو سلطان نے اپنے ملک کی خاطر جان دے دی اور انگریزوں سے کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ آخر
تک لڑتا رہا اور لڑتے لڑتے جاں بحق ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مورخین اور اُدبار کا محبوب
ترین موضوع رہا ہے۔ انگریز مورخین نے اس جنگ

انقلاب ۱۸۵۷ء، اسباب و علل

کو غدر، بغاوت اور فوجی شورشوں کے نام سے موسوم کیا ہے اور وہ اسے جنگ آزادی کی پہلی
جنگ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ غدر تھی نہ بغوت اور نہ فوجی شورش۔
صحیح معنوں میں یہ تحریک تھی جس کو ہندوستان کے تحریت پسند عوام نے، نذیر غدری کے جبروت
اور جور و ستم سے تنگ آکر انگریز سامراج کے خلاف لڑی تھی۔ کوئی بھی غیر جانبدار مورخ اس
حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس جنگ کا مقصد محض ملک کی آزادی اور اپنی تہذیبی

اقدار کی حفاظت تھا اس کے برعکس انگریزوں کا مقصد ملک و قوم پر اپنا تسلط جما نا۔ ہندوستان کے عوام پر مظالم توڑنا اور آمرانہ نظام قائم رکھنا تھا۔

انگریز حکام کے مسلسل مظالم سے ہندوستانیوں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور مسلسل تکالیف، مصائب اور لوٹ کھسوٹ سے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اس سلسلے میں لکھا ہے :-

ہندوستان کی دوست و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر و گنہگاروں نے بہ تدبیر کھینچ لی

۱۸۵۷ء تک لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل رہا۔ اس نے اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کر کے ہندوستان میں کمپنی کی بنیادوں کو استوار کیا۔ باری علیک اپنی کتاب 'کمپنی کی حکومت میں ڈلہوزی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں کمپنی کی فتوحات کو مکمل کر دیا تھا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی تہذیب کا جو خاکہ تیار ہوا تھا اس میں ڈلہوزی نے سرخ رنگ بھر دیا۔ ہندوستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمپنی کے قبضے میں آ گیا۔"

لارڈ ڈلہوزی ۱۸۵۷ء میں مستعفی ہو گیا اور اسی سال لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ ہندوستان آتے وقت لندن میں منعقدہ ایک اوداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کیننگ نے کہا تھا،

"میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پُر امن رہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک ٹکڑا دکھائی دے گا۔ اتنا چھوٹا کہ جتنا انسانی ہاتھ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہو جائیگا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائیگا۔"

کیننگ کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دور رس اور دانشمند انسان تھا اس کی پیش گوئی صادق آئی جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی شکل میں رونما ہوئی۔

وہ کیا اسباب تھے جن سے ہندوستان کے عوام اور دیسی سپاہ کے دلوں میں انگریز سامراج کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی اور وہ بغاوت پر اُتر آئے۔ ذیل میں اس طرح ان اسباب کو مجملہً بیان کیا جا رہا ہے۔

لارڈ ڈلہوزی نے لیسپس LAPSE کی پالیسی لاگو کی جس کے تحت سات ریاستوں شارجا، ناگپور، سمبل پور، جھانسی، جیت پورہ، تجورہ اور کرناتک وغیرہ کو انگریزی راج میں شامل کر لیا۔ لیسپس کا مطلب یہ تھا کہ جن ہندوستانی راجاؤں نے کمپنی کے ساتھ دوستی کا صلح نامہ کیا تھا ان میں سے کسی کے مرجانے کے بعد اگر اس کے کوئی بیٹا نہ ہوتا تو اس کی ساری ریاست پر انگریزی حکومت کا حق ہو جاتا تھا اور کمپنی اس پر قبضہ کر لیتی تھی۔

لارڈ ڈلہوزی کی اس پالیسی سے ارکان ریاست انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔ ان میں احمد شاہ، ناننا صاحب، راؤ صاحب، تانتیا ٹوپی، عظیم اللہ خاں، رانی جھانسی، کنور سنگھ، بہادر شاہ کاہشتہ دار فیروز شاہ وغیرہ شامل تھے۔

بغاوت کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ دہلی کے ساتھ انگریز عملداری کا رویہ اچھا نہیں تھا اور بادشاہ دہلی کے ساتھ مسلسل نامناسب سلوک کیا جاتا تھا۔ بغاوت کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کے ساتھ بھی نامناسب برتاؤ روا رکھا۔ مزید برآں عیسائیوں کے مبلغ مختلف مقامات پر جاتے اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے۔ اسکولوں میں عیسائی مذہب کے مطابق تعلیم دی جاتی اور بچوں سے بھی عیسائی مذہب سے متعلق سوالات کئے جاتے جو عیسائی مذہب کے مطابق ان سوالوں کا جواب دیتا اس کو انعامات سے سرفراز کیا جاتا۔ انگریزوں کے اس مذہبی مداخلت سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں شکوک پیدا ہو گئے اور ان کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ انگریز ان کے مذہب کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

”اسباب بغاوت ہند“ میں سر سید احمد خاں رقمطراز ہیں :-

”پادری صاحب و عظمیٰ صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ

غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت بُرائی اور ہتک سے یاد

کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی اور ہمارے
تارا ہنگی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔

عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ صرف عوام میں کی گئی بلکہ فوج میں بھی اس کا خوب پرچار کیا گیا۔
کچھ افسر تو محض اسی غرض سے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر معمر تھے کہ ہندوستان میں سپاہ کو لالچ دیکر
انہیں عیسائیت میں داخل کر لیا جائے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان میں سپاہ رقتہ رقتہ انگریزوں
سے مستغیر ہونے لگی۔

بنگال کی پیدل فوج کے ایک انگریز کمانڈر نے اپنی سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے :-
”میں لگاتار اٹھائیس سال سے ہندوستان میں سپاہیوں کو عیسائی بنانے کی پالیسی
پر عمل کر رہا ہوں اور غیر عیسائی کی روح کو شیطان سے بچانا میرے لئے فوجی
فرصت کا ایک جز بن گیا ہے۔“

سر سید احمد خاں ”اسباب بغاوت ہند“ میں لکھتے ہیں :-

”مداخلت مذہبی میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور ناقابل اور ادنیٰ و اعلیٰ
جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج
میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے
ملک کے رسم و رواج پر ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی کا یہی ہے :-

سر سید احمد خاں نے ہندوستان میں اس بغاوت کا جو سب سے بڑا سبب بتایا ہے
وہ یہ ہے کہ لیس لاکھوں کو نسل میں ہندوستانیوں کو شریک نہ کیا گیا۔ وہ بغاوت کے اسباب پر
روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

”ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات
اور ان کے مصائب سے جو ان پر گزرتی تھیں اور جس سے رعایا کا دل گورنمنٹ

۱۔ سر سید احمد خاں ”اسباب بغاوت ہند“ اگست ۱۹۵۵ء ص ۴۵-۴۴۔

۲۔ پنڈت سندھ لال ”سن ستاون“ اشاعت ۱۹۵۵ء ص ۴۶۔

۳۔ سر سید احمد خاں ”اسباب بغاوت ہند“ ایڈیشن ۱۹۵۵ء ص ۴۳۔

راقم الحروف سرسید احمد خان کی مذکورہ بار بار اسے سے متفق نہیں ہے اور انگریز مورخین بھی اس بات کے شائبہ میں کہ گورنمنٹ رعایا کے تمام تر مصائب اور تکلیفوں و پریشانیوں سے بخوبی واقف تھی اور جان بوجھ کر انگریزوں نے ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جس سے ان میں غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ یہ لاوائے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی شکل میں پھٹ کر رہا۔

ایک فرانسیسی خاتون نے غدر کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے۔ ”اکبر آباد اور اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی بغاوت کی خبریں نہ سنی جاتی تھیں لیکن ہندوستانی ملازموں کی صورت سے ناراضاندی کی علامتوں اور بغاوت کے اثرات نمایاں تھے۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرز حکومت اور غلبہ سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ اپنے خیالات کی پردہ داری نہ کر سکتے تھے۔“ چاروں طرف غدر کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ عوام اور سپاہ متنفر ہو چکی تھیں۔ طرح طرح سے بغاوت کے پروپیگنڈے کئے جا رہے تھے۔ اشتہارات چسپاں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں جدید طرز کے چربی والے کارتوس آئے جو سورا اور گائے کی چربی سے تیار کئے گئے تھے۔ پنڈت سندر لال اپنی کتاب ”سن ستاون“ میں چربی والے کارتوسوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

”بیرک پور کے پاس ان کارتوسوں کو بنانے کے لئے ایک کارخانہ کھولا گیا۔ ایک دن دم دم گلے ایک برہمن سپاہی پانی کا لوٹا ہاتھ میں لئے بیرک پور کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک بہتر نے اگر پانی پینے کے لئے سپاہی سے لوٹا مانگا۔ سپاہی نے ہندو رواج کے مطابق لوٹا دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر بہتر نے کہا تم اب بات بات کا گھمنڈ نہ کرو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بہت جلد ہی تمہیں اپنے دانتوں سے

گلے کا گوشت اور سُر کی چربی کا مٹی ٹپ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں 'سرجان کے' بھی اس بات کی تائید کرتے ہوئے

لکھتا ہے :-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چمکتے مسالے کو بنانے میں گلے و سُر کی

چربی کو استعمال کیا گیا تھا۔"

ہندوستانی سپاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں جن لوگوں نے نکار

کیا انھیں سخت سزائیں دی گئیں اور تمام فوج کے سامنے مریدان و ردیاں تار دی گئیں،

اور بیٹیاں پہنا کر دس دس سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ ایسی سپاہ و غم و غصہ سے بیتاب تھی

لیکن مجبور و لاچار کھڑی تماشا دکھتی تھی۔ نتیجے کے طور پر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ایسی سپاہ نے اپنی

بیرکٹ میں آگ لگا دی اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ کرنل فینی باغی سپاہیوں کو انکے فرائض

کا احساس دلانے کے لئے آگے بڑھا تو ایک سنسناتی ہوئی گولی نے کرنل کو ختم کر دیا۔ کرنل

فینی پہلا انگریز کرنل تھا جو باغی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد جو انگریز افسر عورتیں

بوڑھے، بچے دکھائی دیئے انھیں قتل کر دیا۔ دوسرے روز یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو باغی دلی پہنچے،

اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہوئے۔ سلامی دی اور عرض کیا :-

"محضراً، انگریز عسکری کے نام است بڑاؤ و زیادتیوں سے تنگ کر و جب

حکومت نے ہمارے دھرم میں مداخلت کی و رعیتی چربی والے کارتوسوں کو استعمال

کرنے پر مجبور کیا تو ہم نے یہ سب کیا۔ باغی کہتے تھے اگر ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے

ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی۔"

جب باغی سپاہی بہادر شاہ ظفر کے پاس کمک کے لئے پہنچے تو انہوں نے باغیوں کی مدد کرنے

سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ کشت و خون کے حق میں نہیں تھے۔ ورنہ باغیوں سے کہا کہ میں نے

ریزیڈنٹ صاحب کو بلوایا ہے اس سب سے میں ان سے گفت و شنید کروں گا۔ ریزیڈنٹ صاحب کے

۱۔ پرنٹس مندرجہ ذیل سنندون اشاعت ۱۹۵۷ء ص ۶۱۔ ۲۔ باری علیگ "کبھی حکومت" ص ۳۸۰۔

۳۔ سرسید احمد خان "اسباب بغاوت ہند" ص ۴۵۔

آئے پر گشتگو کے دوران ایک باغی نے گولی چلا دی۔ ریزیدنٹ بال بال بچا۔ اس کے بعد سپاہ نے قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہندوستان کے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔

جنگ آزادی کے جات بازوں میں جرنل بخت خان کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ بخت خاں کی قیادت میں بریلی، تاجپہاں پور، مراد آباد، اور بدایوں سے باغی فوج ہتھیاروں سے مسلح دہلی پہنچی، اس کے بعد بغاوت ملک گیر پیمانے پر شروع ہو گئی۔ بخت خان نے ملک گیر سطح پر باغی فوج کی قیادت کی اور وہ آخر تک لڑتا رہا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد بخت خان غائب ہو گیا اور آج تک اس کا سراغ نہ مل سکا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ملک گیر سطح پر ہونے والی بغاوت کسی مخصوص طبقے یا فرقے کی جنگ نہیں تھی اور نہ ہی کسی منصوبے کے تحت لڑی گئی تھی بلکہ یہ لاوا تو جنگ پلاسی سے پک رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء میں اچانک پھوٹ پڑا، ملک گیر پیمانے پر پھیلنے والی اس تحریک میں سے ہندو مسلمان اور سکھوں نے کاندھے سے کاندھا کر اپنے وطن کی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جنگ کی تھی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی وجوہ

ملک گیر سطح پر اس بغاوت کی تاریخ ۳۱ مئی طے پائی تھی۔ اسی اثناء میں چربی والے کارتوس آئے اور ہندوستانی سپاہ کو اس کو استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ دیسی سپاہ نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تو انھیں سخت سزائیں دیں۔ میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہو سکا اور مئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلا دی۔ جو منصوبہ بدعت کو شروع کرنے کا ہندوؤں نے بنایا تھا اس سے قبل ہی جنگ کا آغاز کر دیا گیا، اگر جنگ کا آغاز طے شدہ تاریخ یعنی ۳۱ مئی کو بیک وقت پورے ہندوستان میں ہوا ہوتا تو انگریز حکمرانوں کا ہندوستان پر قبضہ آسان نہ ہوتا۔

ہندوستانی اس جنگ میں ناکام ہوئے، ناکامی کی بعض اہم وجوہ تھیں۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقے اور والیان ریاست نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے برطانوی حکومت کی مدد کی۔ زمیندار طبقے کو اس بات کا خدشہ تھا کہ جو جاگیریں انگریزوں سے انہیں ملی

میں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگیریں ان سے چھین جائیں۔

ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانی کسی ایسے مرکزی لیڈر کا انتخاب نہ کر سکے جو پوری تحریک کی مجموعی قیادت سنبھالنے اور مختلف علاقوں اور طبقوں کے افراد کو متحد کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا۔ ہندوستانیوں کے پاس جدید ہتھیار بھی نہیں تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی بھی کمی تھی۔ سب سے زیادہ یہ کہ وہ کسی طرف منظم نہیں تھے اس لئے وہ باقاعدہ محاذ بنا کر نہیں لڑے۔ انگریزوں نے ڈاک اور تار کے نظام سے بھی فائدہ اٹھایا۔ جبکہ ہندوستانیوں کو اس سلسلے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کو گواہی کے ششکر راؤ، حیدر آباد کے سالار جنگ، نیپال کے جنگ بہادر مان بہادر سنگھ اور سکھوں کی بھی حمات حاصل تھی۔

اس کے برعکس انگریز منظم طریقے سے جنگ کرتے رہے۔ ان میں نہ جذبے کی کمی تھی اور نہ جدید قسم کے ہتھیاروں کی۔ مورانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی رہنماؤں کی ناکامی اور شکست کی وجوہ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”بغاوت کے سربراہوں میں بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے برخلاف انگریز اپنی عہد کے تئیں وفاداری کے جذبے کے تحت لڑ رہے تھے۔“

ہندوستانی جانبازوں میں رانی کیشی بائی، جھانسی کی رانی، ردھیل کھنڈ کا بخت خان، اودھ کی بیگم حضرت محل، تانیا ٹوپے، احمد شاہ، خان بہادر، کنور سنگھ وغیرہ ایسے قابل فخر لوگ تھے جو برطانوی سپاہ اور کمانڈروں سے کسی طرح کم نہ تھے لیکن ان کی طاقت منتشر تھی۔ ان کا کوئی مرکزی محاذ نہیں تھا جہاں سے ان کی فوجوں کی تنظیم ہوتی اور مختلف علاقوں میں برسرِ پیکار ہوتے ان میں آپسی نا اہمیاں ہوتا۔ یہ بہادر منظم طور پر اور مشترکہ کمان کے تحت لڑنے کے بجائے اپنے اپنے طور پر ہندوستان کے مختلف اطراف میں بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک نتائج اور اثرات

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا باب ہے جو خونی واقعات سے لبریز نظر آتا ہے اس قیامت صغریٰ کے حالات و کوائف بیان کرنے سے روئ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بغاوت ناکام ہو گئی۔ بغاوت کے فروغ ہونے کے بعد انگریزوں کے سفاکانہ انتقام اور قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع ہو گیا مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ ان کی صنعت و حرفت تباہ کر دی گئی۔۔۔ نہیں طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں ان کے دین و ایمان کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ انگریزوں کے سلسلہ مظالم اور زیادتیوں سے تنگ آ کر جب ہندوستانیوں نے نجات پانی چاہی تو انھیں سختی سے کھلا گیا اور انگریزوں نے انھیں اسی عبرت ناک سزائیں دیں کہ وہ جنگیز خاں سے ماری لے گئے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی ۱۸۵۷ء کا پس منظر بیان کرتے ہوئے "۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامہ" میں لکھتے ہیں :-

" ۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی و ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ مغیہ سلطنت کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ و نسل، مذہب و ملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصہ تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر دم توڑ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانے سماجی نظام اور پرانے نظریات و وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرٹ فکر و نظر کے سانچے ہی کو توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل دیتی ہیں۔"

جب ہم ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں انگریزوں کے مظالم پر نظر ڈالتے ہوئے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سندھ و ستانیوں کو شارح عام پر پھانسیاں دی گئیں۔

خلیق نظامی رقمطراز میں :-

لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو بھانسی پر لٹکا دیا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اس قسم کی موت کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ ایک روز توپ کے بہت بڑے دھماکے سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی گھر وحشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھر ہوا تھا جن کے پورے جانے سے بد قسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑ رہا تھا اور پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گر رہے۔

دہلی میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں :-
”سب سے زیادہ غیرتناک دہلی کی تباہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی ہنگامی تحریک کا ہی مرکز نہ تھی بلکہ ایک تمدن کی آخری نشانی تھی۔ وہاں کی ہر چیز اپنی تاریخ رکھتی تھی انگریزوں نے اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ چوک سدا شد خاں، اردو بازار، خانم کا بازار، پلائی بیگم کا کوچہ، دریا گنج کی گھائی کلیوں کا بازار، پنجابی کٹرا، دھوبی کٹرا، رام گنج، سعادت خاں کا کٹرا، رام جی داس کا گیدہ دالے کے مکان کے علاوہ شاہی درگاہ، دارالافتاء، اکبر آبادی مسجد، اورنگ آبادی مسجد، چوہی مسجد کو اس طرح مسمار کیا کہ نام و نشان تک باقی نہ چھوڑا۔“

مسلمانوں کی سزا جو عہد تناک طریقہ انگریزوں نے اختیار کیا تھا کہ وہ سینیں گرم کر کے باغیوں کو دافنتے تھے، اس کے تصور سے بھی تبسم کے روئیٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمان براہ راست طور پر متاثر ہوئے اور کثرت کے ساتھ انگریزوں کی تہذیب و نظام کا نشانہ بنے کیونکہ مسلمانوں کا اس تحریک میں سب سے زیادہ حقہ رہا تھا۔

انگریزوں کے سناکانہ انتقام کا ذکر کرتے ہوئے خلیق نظامی لکھتے ہیں،
 ”ہزاروں مسلمان معمولی معمولی شبہات پر تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ہزاروں مسلمان گھراسنے
 ناکِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور سینکڑوں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم میں
 در در مارے پھرنے لگے۔“

پسندت سدر لال ’ ’رسل‘ کے حوالے سے مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم کے بارے میں
 لکھتے ہیں :-

”مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انھیں سو رکی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا۔ ان پر سُر کی
 چربی مل دی جاتی تھی اور پھر ان کے جسم جلا دیئے جاتے تھے۔“

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ نے اپنی کتاب ”ہندوستان میں اکتالیس سال“ میں ۱۸۵۷ء کے دلدور
 واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”۱۸۵۷ء کے غدر میں ستائیس ہزار باغی مسلمانوں کو پچاسی دی گئی اور قتل عام
 میں جو مسلمان مارے گئے ان کا کوئی شمار نہیں۔“

غرض یہ کہ مسلمان مرد، عورت، بوڑھوں اور بچوں کی کوئی تمیز نہ رکھی گئی۔ غدر کے بعد جب
 مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ کیا گیا تو پہلے کی بہ نسبت ایک چوتھائی آبادی بھی باقی نہ رہی تھی۔ بنارس کے
 اہم مراکز میں میرٹھ، دہلی، لکھنؤ اور رد بلیکینڈ کے نام خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ
 بجنور، مراد آباد اور امر وہہ وغیرہ کے حریت پسندوں نے بھی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ دہلی
 میں خصوصیت کے ساتھ مسلمان انگریزوں کے تعذیب و تشدد کا نشانہ بنے۔ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے
 خواجہ حسن نظامی ایک انگریز افسر کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”ہم نے اس قسم کی سینکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوؤں میں لاشوں کے
 سبب جگہ نہ ہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں یا مٹی تھیں جس وقت ہم
 نے انھیں نکالنا چاہا تو وہ چپینے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ اور گولی سے مار

ڈالو۔ ہم شریف ہو بیٹیاں ہیں۔ ہماری آبرو و خراب نہ کرو اور جب ہم ان کو باہر نکالتے تو وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتیں تھیں اور بعض ان میں بیہوش ہو کر گر پڑتی تھیں۔ انگریز مورخین خود بھی ان مظالم کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کی تواریخ میں بھی یہ واقعات جہاں تہاں مل جاتے ہیں۔

مولانا سید احمد علوی اسپنسرو لیوں کے حوالے سے دہلی کی قتل و غارتگری کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہ پائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ واپول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔“

دہلی دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آگئی، اور انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بخت خان (جو باغی سپاہیوں کا لیڈر تھا) نے بہادر شاہ ظفر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیا لیکن مرزا الہی بخش جو میجر ہڈسن کا مخبر تھا اس نے بیگم زینت محل اور بادشاہ کو بخت خان کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ ادھر مرزا الہی بخش نے ہڈسن کو اطلاع کر دی اور ہڈسن نے فوج کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کا محاصرہ کر لیا۔ بہادر شاہ ظفر، زینت محل اور نو عمر شہزادے جواں بخت کو گرفتار کر لیا گیا۔ جنرل بخت خان اپنی فوج کے ساتھ دلی سے چلا گیا۔ اور آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

دہلی کو فتح کرنے کے بعد انگریز ملک کے مختلف اطراف میں پھیل گئے اور انتقام لینے شروع کر دیئے۔

”فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں

ڈال دیا اور قتل و غارت گری کا ہنگامہ برپا کیا جس کی مثال انیسویں صدی کی تاریخ میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان اس ظلم و بربریت کا شکار ہو گئے۔

دہلی کے بعد جو شہر انگریزوں کی بربریت کا سب سے زیادہ نشانہ بنا وہ لکھنؤ تھا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہ شہر بھی فرنگیوں کی تباہ و بربادی سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ "تاریخ لکھنؤ" کا مصنف لکھنؤ کی تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے:-

"مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد شہر لکھنؤ تقریباً پندرہ دن تک لٹا رہا۔ ہزاروں بے روزگار قتل کر دیئے گئے۔ سینکڑوں باعصمت خواتین نے حفظ ناموس کی خاطر خودکشی کر لی۔ دولت مند نان شبینہ کو محتاج ہو گئے مگر سامراج کا غیظ و غضب اس پر بھی کم نہ ہوا اور یہ حکم ہوا کہ جہاں جہاں باغیوں نے قیام کیا ہو اور جہاں کے باشندوں نے ان کی مدد کی ہو ان سب محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ چنانچہ دریائے گوتمی کے کنارے جتنے بھی مکانات تھے یا تو نذرِ آتش کر دیئے گئے یا بارود لگا کر اڑا دیئے گئے۔ شہر کے کتنے محلے اور بازار تھے جن کا آج نام و نشان تک نہیں ملتا۔"

مذکورہ حوالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریزوں نے حریت پسندوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی۔ مصنف "آکسفورڈ تاریخ ہند" اپنی مخصوص زبان میں اس منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے:-

"یہ بغاوت اپنے پیچھے بے شمار خونخوار حادثات بے انتہا مصائب اور متعبد و ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی ہے جن کے ذکر سے بھی قلب کو صدمہ پہنچتا ہے۔" انقلاب مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس منظم شکست سے ہندوستانیوں نے کچھ تجربات حاصل کئے جس سے مستقبل میں وہ قومی تحریک کی اساس کو استوار کرنے کے لائق ہو گئے اور اس طرح ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔

۱۔ خلیق احمد نظامی "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامہ" ص ۵۱۔ ۲۔ اجلہ علیاں "مختصر تاریخ ودھ" اشاعت اول ۱۹۷۷ء ص ۲۰۹۔ ۳۔ شیخ حسام الدین (مترجم) "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" اشاعت دوم ۱۹۷۷ء ص ۱۱۔

تحریک آزادی کا سفر



انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے آزادی ہند تک

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام | انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہندوستان

کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے منتقل ہو کر براہ راست حکومت برطانیہ کے زیر نگیں آگئی۔ ادھر انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مسلمان بالخصوص انگریزوں کے مظالم کا شکار بنے۔ ہندوستانیوں نے بھی اپنے ملک کو آزاد کرانہ مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ ایک طرف سیاسی سطح پر عوام کا استحصال، دوسری طرف اس جبر و تشدد و رشتہ کے خلاف عوام کے دلوں میں سنگتی ہوئی غم و غصہ کی آگ، نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور حکومت کے مابین کشیدگی روز بروز بڑھتی رہی۔ اس صورت حال کے پیش نظر انگریزوں کو ایک ایسی انجمن بنانے کی فکر ہوئی جس سے عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ قائم ہو سکے اور حکومت کے خلاف عوام کے دلوں میں پھتی ہوئی مخالفت کا مناسب طریقے سے سدباب کیا جاسکے لہذا ایک ریٹائرڈ افسر - اے۔ او ہیومٹ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی تجویز و ایما پر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا خیال تو پہلے ہی چند سربراہان و انگریزوں کے ذہنوں میں آیا تھا لیکن اس کی باضابطہ طور پر تشکیل ۱۸۸۵ء میں عمل میں آئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوگل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں ڈبوسی مینرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف اطراف سے آئے ہوئے بہتر نمائندوں نے شرکت کی۔

تواریخ کانگریس کا مصنف "انڈین نیشنل کانگریس" کے پہلے اجلاس کے بارے میں لکھتا ہے:-

"انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس تو قراردادوں کے باعث قابل ذکر ہے

جنہیں ہندوستان کے قومی مطالبات کی ابتدا کہا جاسکتا ہے۔"

کانگریس کس نہج پر قائم کی گئی اور اس کا مزاج کیا تھا اس سلسلے میں سر جان کنگ لکھتا ہے:-

۱۔ چٹائی سیتارامیہ "تواریخ کانگریس" مجازی پریس لاہور، ص ۲۸۔

”کانگریس کی تشکیل مغربی تئیں اور مغربی نمونے کے مطابق ہوئی۔ اس کا تمام نظام اور اس کی رُوح مغربی ہے۔ اور جن اغراض و مقاصد کا اس نے اعلان کیا ہے وہ بھی مغربی سیاسیات ہی سے ماخوذ ہے۔“
 لارڈ ڈڈن نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی غرض و نیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :-

”حاکم ورنیکولر دونوں کے لئے یہی بہت کم ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ
 ساری جماعت ہو کر حکومت کو بتائیں کہ اس معاملہ میں کیا نفاذ میں ہے اور نہیں کیا
 رفع کیا جا سکتا ہے۔“

انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ کے مطالعے سے ذہن میں یہ سوں بھرتے ہیں کہ اس انجمن کے قیام کا خیال ایک انگریز کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ ایک غیر ملکی کو ہندوستانیوں کے مسائل سے کیا دلچسپی تھی؟ مہوم اس انجمن کی ترویج و ترقی میں اتنی دلچسپی اور جہاد سے کیوں محض رہا تھا اور کانگریس کے اغراض و مقاصد کو غوام تک پہنچنے کے لئے ہندوستان کے شہ وں کا دورہ کرنا تھا؟ اور لارڈ ڈڈن ہندوستان کے سیاسیات را اصحاب کو ایک پلیٹ فارم پر کیوں جمع کرنا چاہتا تھا؟

انڈین نیشنل کانگریس نہ قومی جذبہ کے تحت قائم ہوئی تھی و نہ اسے عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی تھی۔ ابتدا میں اس انجمن کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں بھلی ہوئی سمجھنی و ران کے باغیانہ جذبات کو سمجھا جا سکے اور کانگریس کے اجلاسوں میں انگریز ہندوستانیوں کے باغیانہ خیالات اور منصوبوں سے باخبر ہو جائیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے توسط سے اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں اور ہندوستانیوں پر پنا تسلط برقرار رکھ سکیں لیکن انگریزوں کے خوب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ آہستہ آہستہ کانگریس نے قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی آخر میں یہی انجمن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے انحطاط کا اور زوال کا باعث بن گئی۔

کانگریس کے قیام کے بعد کئی سال تک اس کے اجلاسوں میں صرف ریزولوشن پاس ہوتے رہے اور گزشتہ اشارات کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ کانگریس کے ہندوستانی رہنماؤں میں دہلی اور گرجی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان میں بیداری ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان کی قومی آزادی کی مانگ کی جانے لگی۔ اس دوران کانگریس کے غرض و مقاصد میں بتدریج تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں کانگریس کا مقصد حسب ذیل متعارف پایا

”انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد جو ام کی کونسٹیوٹنٹ سے ملنے گورنمنٹ کے سائن کا حصول ہے جو برطانوی سلطنت کے دوسرے ممبران کو حاصل ہے۔“

سر آکلینڈ کانگریس کے قیام کو انگریزوں کے مستقبل کے لئے خطرناک تصور کرتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ کانگریس کی تحریک قوم پرستوں اور باغیوں میں نفرت کی حیل پیدا کر دے گی۔ اس نے کانگریس کی ہیئت کو ختم کرنے کے لئے ایک تقریر کے دوران کہا تھا۔

”کانگریس نہایت بے انصافی سے اپنے آپ کو ہندوستانی آبادی کا نمائندہ کہتی ہے۔“

سر آکلینڈ کے مذکورہ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دور میں وردان شور نسان تھا۔ اس کی پیش گوئی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں صادق آئی۔ کیونکہ اس وقت تک کانگریس نے مکمل طور پر قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اب یہ انجمن انگریزوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی قومی انجمن بن چکی تھی۔ اور اس کا نصب العین یہ قرار پایا تھا۔

”انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی کردار نہ صرف وطن کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا بلکہ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد سے ذات برادری اور پنج پنج کی تفریق ختم کر کے عنریب امیہ کے فرق کو مٹا کر ایک متحدہ ہندوستان حاصل کرنا تھا۔“

لے پٹانی سینٹارامیہ ”تورینج کانگریس“ ص ۹۔

لے پٹانی سینٹارامیہ ”تورینج کانگریس“ ص ۱۱۳۔

سید خان عبدالودود خان ”تحریک آزادی دیکھتی“، شاعت اول ۱۹۵۵ء، ص ۱۵۰۔

دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۴۷ء کے موقع پر کانگریس کے سلسلے میں گاندھی جی نے اپنی تقریر کے دوران جو کچھ کہا تھا اس تقریر کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

..... کانگریس ان بے زبان مفلس اور فاقہ کش لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں سست لکھ دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اور اس بات سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور آیا وہ ہری نومی ہندوستان کے باشندے ہیں یا ریاستوں کے۔ ان کی حفاظت کو کانگریس ہر طرح پیش نظر رکھے گی۔ اور کانگریس یہ کہوں تو کوئی مبالغہ تصور نہیں ہوگا کہ کانگریس ان بے زبان اور سست لوگوں کی خاطر بہ ممکن قربانی کرے گی۔ اس لئے یہ کسانوں اور غریبوں کی جماعت کہی جاسکتی ہے۔

کانگریس کو مشہور و راستور بنانے میں جن عظیم الشان لوگوں نے ہمدردی اور موثر کردار ادا کیا ہے ان میں دادا بھائی نوروجی، آنند چارلو، ڈی۔ یو۔ اچھا، جی۔ کے گوکھلے، بدرالدین تہیہ حسن امام، جسٹس کاشی ناتھ، ڈبلیو۔ سی۔ مینرٹی، لوک، نیتھک، سر پندرناتھ مہرجی، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سر فیروز مہتا، آنند موہن بوس، مولوی منہا الحق، اجودھیا ناتھ، راجہ رام پال سنگھ، کالی چرن بھرجی، نواب سید محمد بہادر، مہیکا چرن موزدار، بھوپندر ناتھ بامو، پنڈت لشن نارائن دھر، رمیش چندر، ڈاکٹر مختار احمد نصاری، پنڈت موہن لال نہرو، جو بہاؤ نہرو، مورنا ابو کلوم آزاد، اور گاندھی جی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کانگریس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا جلس منعقد ہوا تو اس موقع پر کانگریس میں تہہ پسندی کا ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کی ابتدا تک کانگریس کی پالیسی معتدل تھی۔ یوں یوں وقت گزرتا گیا کانگریس کی پالیسی میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں کانگریس پر تہہ پسندوں کا تسلط ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی فریقہ ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے آزادی کی تحریک میں باضابطہ حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں جب دہلی میں پنڈت موہن لال نہرو کے

زیرِ صدارت کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا، گذارشات اور عرض دہشتوں کی جگہ قومی مطالبات نے لے لی۔ اسی سال کانگریس کا نصب العین "سوراج" قرار دیا گیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں صدر کی حیثیت سے مسٹر سی۔ آر۔ داس نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا:

"ہمارا نصب العین سب سے پہلے نیشنلزم ہے۔ ایک ایسا عمل جس کے ذریعے قوم

کی ہستی کا اظہار ہوتا ہے اور ہندوستانی قوم کی حقیقی ترقی سوراج کی منزل سے

وابستہ ہے۔ اس لئے ہندوستان کے تمام مسائل کا حل آج سوراج کا حصول ہے۔"

تقسیم بنگال | بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی عوام کا شعور یورپ سے طور پر بیدار ہو چکا تھا۔ نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ لارڈ کرزن جو ۳۰ دسمبر ۱۸۵۷ء میں

ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا تھا۔ اس نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تقسیم

بنگال کی کارروائی کے سبب ہندوستان میں اچھی خاصی شورش پیدا ہو گئی اور ہندوستان کے عوام

صوبہ بنگال کی تقسیم کے مسئلے پر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ڈاکٹر راجندر لکھتہ ہیں:

"۱۹۰۵ء کا سال ایک ناقابل تسکین المیہ کا سال تھا۔ وہ شدید حادثہ بنگال کے ٹکڑے

ٹکڑے کرنے کا تھا۔"

مسلم لیگ کا قیام | یہی وہ دور تھا جب "مسلم لیگ" کے قیام کا شعور پیدا ہوا۔ اور "ہندو

مہا سبھا" اسی سال معرض وجود میں آئی۔ ۹ نومبر ۱۹۰۶ء کو نواب

سلیم اللہ خاں بہادر ڈھاکہ نے ایک تحریجیاری کی جس میں تجویز کیا گیا کہ مسلم انڈیا کنفیڈریٹس

MUSLIM INDIA CONFEDERACY کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے۔ اس جماعت

کے اغراض و مقاصد اور مجوزہ کاموں کا خاکہ رنیکر بزرگان قوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور مشوروں

کے لئے ۹ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس کے ساتھ آل انڈیا ایکویشنل

کانفرنس کو بھی سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس موقع پر ہندوستان کے تمام مسلم

سیاسی رہنماؤں کا اجتماع ہوا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ

لئے سید عذی "کارواں آزادی" میں ۱۰۔ ۱۱ مارچ ۱۹۰۶ء "تاریخ تحریک آزادی ہند" مترجم صدر عباس جلد سوم

اتحادیت ۱۹۰۶ء میں ۳۴۹۔

منعقد ہوا جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ نواب وقار الملک سیکریٹری اور نواب محسن الملک جوائنٹ سیکریٹری مقرر کئے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد ۱۹۰۷ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر جن سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی ان میں نثار احمد خاں، حسین شہید سہروردی، عبدالرحمن صدیقی، مولانا محمد علی، سید غلام حسنین، غازی عبدالغزیز، مولانا شوکت علی، سید بقار الحسن، فضل محمد علی خاں، شیخ عبداللہ، عبدالمجید، سید نبی اللہ عبدالستار، رفیقی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب محمد علی، راجہ نوشاد علی، نواب سرطیم اللہ خاں، شرف الدین، نواب محسن الملک، سید رفیع، لدین احمد، مولانا مظہر علی خاں، خورشید سیدی، عبدالمکریم ظہور احمد، شاہ مصطفیٰ، وزیر حسن، شمساد احمد خاں، محمد یوسف، چودھری غلام مصطفیٰ، نواب سید نواب علی، محمد علی حبس شاہ دین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہندوستانیوں نے اس جنگ میں انگریزوں کی بھرپور اعانت کی اور ملک بھینچا۔ تقریباً دس لاکھ ہندوستانی برطانیہ کی طرف سے بڑے کئے گئے۔ انہوں نے فرانس سے مشرقی افریقہ تک اپنی بہادری و وفاداری کے جوہر دکھائے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر وہ ان کے جائز حقوق دیدیں گے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو انگریز اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ مزید برآں ہندوستانیوں پر سخت ترین قوانین نافذ کئے گئے اور شدت کے ساتھ حریت پسندوں کو کچلنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ادھر ۱۹۱۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں ایک ساتھ ہوئے۔

رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء کے وٹمن مسٹر جسٹس اس رولٹ کی قیادت میں رولٹ ایکٹ کمیٹی قائم ہو گئی۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ انہ دون ملک حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کی تحقیقات کرے اور ان کا انسداد بھی اس ضمن میں بریل شدہ رولٹ ایکٹ کمیٹی کے تحت ایک رپورٹ پیش کی گئی اور ہندوستانی عوام کی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی رولٹ ایکٹ کا واضح مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عوام دین و عوام کو گرفتار کر کے تحریک کو دبا دیا جائے جس سے وہ گئے نہ اٹھاسکے، لیکن اس کارروائی میں یہ سوا کہ ہندوستان کے عوام

اور بھی سرگرم ہو گئے۔ مسٹر جناح اور گاندھی جی نے اس ایکٹ کی شدت سے مخالفت کی۔

ستیہ گرہ کی تحریک | اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ اگر حکومت کا یہی طریقہ رہا تو ہم ستیہ گرہ کی پالیسی اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن حکومت کے ردیے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ گاندھی جی نے مجبور ہو کر رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ اور ایک حلف نامے کے تحت کہا۔

”ستیہ گرہ یہ حلف اٹھاتا ہے کہ اگر رولٹ ایکٹ منظور کر لیا گیا اور اسے قانون کے صورت دیدی گئی تو وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کریگا تا وقتیکہ قوانین واپس نہ لے لئے جائیں۔“

رولٹ ایکٹ کی ہندوستانیوں نے شدت سے مخالفت کی ”جدوجہد آزادی“ کا مصنف لکھتا ہے۔ ”جب گاندھی جی کے عہد کا پیمانہ لہریز ہو گیا تو انہوں نے ستیہ گرہ کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریک نہ مقامی تھی اور نہ اس کے مقاصد محدود تھے۔ انہوں نے ایک ستیہ گرہ سبھا قائم کی اور ان ظالمانہ قوانین کی پابندی نہ کرنے کا ایک عہد نامہ تیار کیا۔ ۶ اپریل ۱۹۳۱ء کو ملک گیر بڑے سال کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد سول نافرمانی کی نوبت آئی تھی۔ بڑے سال کی کامیابی بے مثال تھی۔“

گاندھی جی کی اس مہم کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نتیجتاً ملک میں توڑ پھوڑ اور بڑے سالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ بمبئی، احمد آباد اور لاہور میں جہاں جہاں عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ڈاکٹر سیف الدین کھٹو، گاندھی اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۳ دسمبر کو فیض آباد، یوپی، میں پولیٹیکل کانفرنس کے اجلاس میں پنڈت نہرو نے پچاس ہزار سے زائد کسانوں کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”انفrazی طور پر بھوک ہڑتال کرنے اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر ستیہ گرہ کرنے کو ہم رد رکھیں گے۔ ستیہ گرہ کا ہتھیار ضروری قومی مقاصد کے لئے مقصود ہے، میں نے

لے صلاحات الہ ناسک ”تحریک آزادی“ پنجاب رٹ پریس لاہور میں ۱۹۳۱ء۔ ”جدوجہد آزادی“ از میں پند آفریں تراخی بر سر طے، مترجم غلام ربانی، تہاں، شاعت ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۔

اخبارات میں پڑھ رہے رہ مسلم لیگ نے ”سستی گروہ کے اصول کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ تاہم یہ ایک اچھی ملامت ہے۔ لیگ نے سیاسی طور پر --- ایک بار بھی کانگریس کی تقلید کی۔ ہمیں ملک میں آزادی کی جدوجہد کے لئے تیار ہونا پڑا۔ تمہیں آزادی ابھی تک نہیں ملی۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ایک ہب دور گڑھ والی پچھلے ساڑھے آٹھ سال سے جیل میں محبوس ہے اور ابھی تک اسے رہا نہیں کیا گیا۔“

ہوم رول لیگ : ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک ایسی خاتون کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا جو ہندوستانی نہ ہوتے ہوئے بھی جنگ آزادی میں برابر کے شریک تھی۔ ہندوستانی مجاہدین کی آواز میں آوازیں ملا کر جنگ آزادی میں شریک رہیں۔ اس خاتون کا نام اینی بیسنٹ تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں اینی بیسنٹ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے نیوٹن کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کیا تھا۔ اس خاتون کے دس میں ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اینی بیسنٹ نے سوشلزم میں مراعات میں ہوم رول لیگ کے نام سے ایک نئی تحریک کی تھی۔ جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ اینی بیسنٹ نے انگریزوں کے خلاف تحریک کرنا شروع کر دی۔ اینی بیسنٹ کے اس باغیانہ رویہ کو دیکھ کر ۱۹۳۱ء میں انگریزوں نے انہیں نظر بند کر دیا۔

ڈاکٹر اجندر پراساد اپنی خود نوشت سوانح ”اپنی کب فی“ میں ہوم رول لیگ کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔۔۔

”ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کر کے سارے ملک میں بڑی بھول بھادی تقریبات سبھی صوبوں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔ یہ کار اس سے گہرا گہنی تھی تو اس نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ کو ان کے دوستوں کے ساتھ نظر بند کر دیا۔“

تحریکِ خلافت

پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کو ختم ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ تحریکِ آزادی کی تاریخ میں خلافت تحریک نے بڑا اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ خلافت کمیٹی کا قیام جولائی ۱۹۱۹ء کو عمل میں آیا اور خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت فضل الحق نے کی۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔ اس دور میں مختلف سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ متعدد سیاسی رہنما جیلوں میں تھے۔ مولانا محمد علی جوہر جب جیل سے واپس آئے تو انہوں نے ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم کی تاکہ اس سیاسی تحریک کے ذریعے انگریزوں کی مستحکم اور سفاکانہ پالیسیوں کو بے نقاب کیا جاسکے۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں دلچسپی سے حصہ لیا۔ خلافت تحریک کانگریس کا ایک اہم حصہ بن گئی۔ محمد علی، شوکت علی اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے اثر انگیز تقریریں کیں۔ اس تحریک میں جن سیاسی رہنماؤں نے ایک موثر کردار ادا کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا شاد اللہ امرتسری، مولانا حسین احمد مدنی، غیاث اللہ فرنگی نعلی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بناری، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر منتارا احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، منظر الحق خاں وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ گاندھی جی نے بھی تحریکِ خلافت میں بڑی دلچسپی اور نہماک سے کام کیا تھا۔ قاضی عدیل عباسی "تحریکِ خلافت" میں لکھتے ہیں:-

"تحریکِ خلافت ہے ہمارے ملک میں آزادیِ کامل کی بنیاد پڑی، ورہندہ مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ تحریکِ خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس آجائے میں اس نے اپنے آپ کو دکھایا اور پایا۔"

پہلی جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ انگریز یہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان

کے عوام اپنے جائز حقوق کی مانگ کریں گے لہذا انگریزوں نے اس کے انسداد کے لئے "روٹ ایکٹ" کے نام سے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور انہیں سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں

ہندوستانی رہنماؤں نے برطانوی سرکار کی شکاکانہ پالیسیوں کے خلاف ۲۰ برسوں سے جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلیانوالہ باغ غارتوں سے محسوس ایک کھد ہوا جگہ تھا۔ یہاں ایک تنگ راستہ تھا جہاں سے ایک مسلح کار بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ اس جگہ میں خستہ لوگوں کے انداز کے مطابق تقریباً پچاس ہزار لوگ جمع تھے۔ لوگ پرمین جلیانوالہ سے اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن رہے تھے۔ جنرل ڈائر اور اس کے ساتھی صدر دروازہ سے داخل ہوئے۔ جنرل ڈائر نے فوراً اپنی فوج کی صفیں باندھ کر باغ کا غاصہ کر لیا۔ ڈائر کے حکم پر انگریز سپاہیوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ بہاروں میں ہندو مسلمان و دیگر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ جنرل ڈائر کے بیانہ رویے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ پیدا کر دیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی پنجاب سب کمیٹی کے مطابق
 "جلیانوالہ باغ کا قتل عام بچوں سمیت بالکل بے قصور اور بے گناہ لوگوں پر ایک
 سوچا سمجھا وحشیانہ عمل تھا اور حالیہ برٹش حکومت کی تاریخ میں اپنی سنگ دی
 میں لاثانی تھا۔"

اس حادثہ میں تقریباً دو ہزار ہندوستانی بلک اور کئی ہزار زخمی ہوئے۔ جلیانوالہ باغ کے چونچکاں حادثے کے سلسلے میں سن ۱۹۲۰ء میں مسٹر کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی۔ یہ رپورٹ برطانوی ہندوستانی عوام کے خلاف تھی۔ اس رپورٹ سے ہندوستانی عوام میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۰ء کو منعقدہ بنارس کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں یہ طے پایا کہ ترک موالات
 موالات کی پالیسی اپنائی جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے یکم دو دو جون کو مسلمانوں کا ایک جلسہ ان آباد میں منعقد ہوا اور ترک موالات کی پالیسی کو باخود طور پر منظور کر لیا گیا۔ اور تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی مساعی کی جانے لگیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کھلیر، حسرت موہانی اور حاجی احمد صدیقی جیسے سیاسی رہنماؤں نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں یہ تحریک خاص اہمیت

رکتی ہے۔ اس تحریک میں ہندوستانیوں نے بھرپور دلچسپی لی اور انگریزوں سے عدم تعاون کیا۔

تحریک عدم تعاون ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت کے فرائض سی۔ آر۔ داس کو انجام دینے تھے انگریزوں نے انہیں اجلاس سے قبل ہی گرفتار کر لیا۔ چنانچہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس اجلاس کی صدارت کی اور خطہ صدارت میں فرمایا :-

”عدم تعاون کی روح عام ملک پر طاری ہے اس ہر اعظم کے دور دراز گوشوں میں کوئی بھی دل ایسا نہیں جو سیراج حاصل کرنے اور خلافت و پنجاب کی دست درازیوں کی دادرسی کے لئے ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کے جذبے سے لہریز نہ ہو۔“

عدم تعاون کی تحریک جولائی ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور سرعت سے ملک میں چاروں طرف پھیل گئی۔ اس تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے حسین علوی ”کاروان آزادی“ میں لکھتے ہیں :-

”عدم تعاون و عدم تشدد محض ہندوستانی تحریک نہیں رہی بلکہ یہ بڑی تیزی سے ایشیائی تحریک بن گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب دنیا والے جھوٹ اور نا انصافیوں کے خلاف اسے عالم گیر متحیّار کے طور پر اپنالیں گے۔ تحریک عدم تعاون کی کامیابی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہمارے کارکن بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کر رہے ہیں، اپنے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ دن بدن زیادہ تعداد میں جیلوں کا رخ کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ خوبیوں کی بات یہ ہے کہ حکومت کے بے پناہ جبر کے باوجود کہیں بھی جواب میں تشدد پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس جبر نے قومی عزم کو اور پختہ کرنے کا کام کیا ہے۔ جمعیتہ العلماء کے فتوؤں کی منبلی، مقدمات کراچی، قانون اجلاس باغیانہ، کریمیل اور امنڈمنٹ ایکٹ، ضابطہ قوجداری کی دفعہ ۱۴۴ ان سب کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ لوگوں میں اپنی قومی جدوجہد کو جاری رکھنے اور اپنے مطالبات پر ڈٹے رہنے کا عزم اور بھی

پختہ ہو گیا ہے

عدم تعاون کی تحریک میں ملک کے ہر طبقہ کے فرد نے دلچسپی لی۔ درجنوں اسکولوں، کالجز اور تمام درجوں سے عدم تعاون کیا گیا۔ سکولوں کا جوں کی سطح پر طلبہ نے انگریزوں کا بائیکاٹ کیا۔ انگریزی ماں کاستروں بند کر دیں۔ ڈاکٹر راجندر نارین تحریک آزادی میں لکھتے ہیں:-

”ملک ایک زبردست پھل سے دوچار ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے کروڑوں فرد میں پھیل گئی۔ ہر طرف جوش مقصد میں لگن، قربانی کے لاشانی مناظر دیکھنے میں آئے۔ غیازی حیثیتوں کے دکھ، جیسے موتی لڑا ہوا، مرآہ واس، راجندر پر سادہ، رات گویاں چارہ سنے اپنے اپنے منفعیت بخش پیشوں کو ترک کر دیا۔ ہزاروں طلبہ اپنے اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکل آئے جو اب رات نہ رونے لگے آبادانی کورٹ کو الوداع کہا۔ ورغہم تعاون کے بھنور میں کھنکھنے لگے۔“

سائنس کمیشن ۱۹۳۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کے چیئرمین سر جان سائنس تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ کمیشن صوبوں میں حکومت کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے۔ ۱۹۳۰ء میں جب سائنس کمیشن ہندوستان آیا تو پورے ملک میں کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ احتجاجی جیسے ہوئے درہندہ ہوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کمیشن کے ہندوستان میں آنے کا مقصد محض یہ تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کی ٹڑ میں ہندوستانیوں کو بدنام کرے۔ ہندوستانی، کمیشن کی چاں سمجھ گئے اور انہوں نے متحد ہو کر کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ بٹی میں عوام کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے۔ دھندلہ رہت رہے بھی احتجاج میں شامل تھے۔ ایک احتجاجی جلوس میں لالہ لاجپت رائے پر لٹھیاں برسائیں گئیں جس کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہو گئی۔

سول نافرمانی آزادی کے سلسلے میں چلائی جانے والی مختلف تحریکوں کو مسلسل مقبوضہ

لے حسین علی کاروان آزادی میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء تک راجندر نارین تحریک آزادی ”ماتہ بدھ دیو سبھی“ میں

ہندوستانیوں کے حوصلے بلند ہوتے رہے۔ ان کے عزائم میں بخشی پید ہو گئی اور ہندوستان کے عوام نے سنہ ۱۹۳۱ء میں سول نافرمانی (CIVIL DISOBEDIENCE) کی تحریک شروع کر دی اس تحریک کو بھی پرامن طریقے سے شروع کیا گیا۔ ہندوستان کے عوام نے بلا امتیاز مذہب و ملت اس میں بھرپور حصہ لیا۔ کسی بھی تحریک کے جاری ہوتے ہی کامیابی کی طرف قدم بڑھنے لگتے تھے عوام کے جذبے اور جوش کو دیکھ کر انگریز خائف تھے۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ہندوستان میں اب زیادہ دنوں تک اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، پنڈت نہرو، ذکڑ مختار احمد انصاری وغیرہ متحرک لیڈران کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان سب ہی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک تو مدحم پڑ گئی لیکن آزادی کے تئیں محبان وطن کے جذبات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مورانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب ”تحریک آزادی“ میں لکھتے ہیں :-

”ہم نے آزادی و رحق طلبی کی جنگ میں ”نان و نلنس“ نان کو پرشین کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور غول ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے۔ لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر غنیمت قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ ہمارا گناہ بھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہ کرنا چاہیے۔ اسلام نے جن حاسنوں میں اس کی اجازت دی ہے میں اسے فطرت اور عدل و اخلاق کے مطابق پیش کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لئے ہمارا گناہ بھی کے دلائل سے متفق ہوں۔ اور ان کے دلائل کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان و نلنس جدوجہد کے ذریعے فتح مند ہو گا اور اس کا اخلاقی و ایمانی طاقت کی ایک یادگار مثال ہوگی۔“

سنہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس حکومت سے نوآبادیاتی حکومت کے سلسلے میں گفت و شنید کر رہی تھی لیکن حکومت، نوآبادیاتی حکومت کو ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ ہندوستانیوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر حکومت ہندوستان کو نوآبادیاتی حکومت کا درجہ مل جاتا ہے تو ہم تمام سیاسی سرگرمیاں واپس لے لیں گے۔ لیکن حکومت برطانیہ ہندوستانیوں کو کچھ دینا نہیں چاہتی تھی لہذا سنہ ۱۹۴۸ء میں حکمت کانگریس کے اجلاس میں یہ قرارداد پاس ہوئی۔

لے الہ کلام آزاد ”تحریک آزادی“ ص ۴۳۔

”برطانوی حکومت نے ایک سال کے عرصہ میں ہندوستان کو درجہ نوآبادی نہ دیا تو آئندہ کانگریس ”مکمل آزادی“ کو اپنا نصب العین قرار دے دیگی۔“

انگریزوں نے اس قرارداد کی کوئی پروا نہ کی اور اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا رہے، لہذا ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور کانگریس کے اجلاس میں رات کے ٹھیک بارہ بجے مکمل آزادی کانفرنس شروع ہو گئی۔ یہ ریزولوشن انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں ایک اہم قدم تھا۔ ریزولوشن پاس ہونے کے بعد ہندوستان کے عمائدین سیاست سے غلطی جاملے پہنچنے میں منہمک ہوئے۔ گورنر لوہا غوام نے ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں آزادی حاصل کرنے کا حلف اٹھایا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

”برطانوی حکومت نے ہندوستانی غوام کو آزادی سے محروم کر دیا ہے بلکہ ہندوستانیوں کو برحیثیت سے تباہ کر دیا ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کرے۔ اور کامل آزادی حاصل کرے۔ ہم جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا موثر ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم عدم تشدد کے اصول پر عمل کرتے ہوئے حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ سول نافرمانی کی تیاری کریں گے، جس میں محصول کا داند کرنا بھی شامل ہوگا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو کسی قسم کی امداد نہ دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال دلا دیا جائے تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس نظامانہ حکومت کا پسندیدہ روز میں خاتمہ ہوتا ہے گا۔ لہذا ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس ہم کو جو بھی ہدایت دے گی ہم اس پر عمل کریں گے۔ درحصول آزادی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دیں گے۔“

ہندوستانی اپنے عزائم پر عمل پیرا رہے۔ ادھر گاندھی جی نے قانون نمک سازی کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی انڈین لوگوں کے ساتھ ساہیو کیلئے روانہ ہو گئے اور گجرات کے دیہی علاقوں میں دو سو میل کا سفر کر کے ڈانڈی پہنچے جو ساحل سندھ پر

واقعہ ہے۔ نمک قانون سازی کے خلاف ملک میں تقریباً ایک لاکھ غوام نے گرفتاریاں دیں۔ کانگریس کی مقبولیت و اس کی چلائی ہوئی تحریکوں کی مسلسل کامیابی کو دیکھ کر برطانوی حکومت کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ حکومت نے جدید اصلاحات کے بارے میں غور و خوض کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں لندن میں مسلسل ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء میں تین گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں اس کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور ۱۹۳۲ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستانی ریاستوں کو خود مختاری کے حقوق حاصل ہو گئے اس طرح ہندوستانوں کو مرکز میں ہی نمائندگی ملنے لگی۔

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کی جرمنی-بولیویہ جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ نے اس جنگ کے خلاف غلامی جنگ کر دیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات خراب ہونے لگے۔ اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۰ء کا کراچی کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں یہ تجویز کاہل گیا کہ مرکز سے ملحقہ ہے، غرض و معاہدہ میں کرتے رہے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک سرکار نے غور و خوض کرنے اور آخر کار عمل تیار کرنے کے لئے ۱۹۴۰ء میں بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں ہندوستان چھوڑو تحریک (INDIA FREEDOM MOVEMENT) کا ریزولوشن پاس کر دیا گیا۔ اس ریزولوشن کے پاس ہوتے ہی نگریزوں میں بے صبری پیدا ہو گئی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا اور پوری طرح اس تحریک کو ناکام کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ہندوستان چھوڑو تحریک ملک گیر سطح پر شروع ہو گئی کیونکہ عوام مقتدر بیڈروں کے گرفتاری سے مشتعل ہو گئے۔ ملک میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سیاسی رہنما اس تباہ کن پالیسی کے خلاف آگے بڑھ کر روک روک سکے۔ انھوں نے انگریزوں کے انتقام کی آگ اور تیز ہو گئی اور اندھا دھند گرفتاریاں کرنے لگے۔

آزاد ہند فوج جی ورامانہ تھامب پتیا جی سبجاش چندر بوس کے دل میں "آزاد ہند فوج" کے قیام کا خیال پیدا ہوا اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء کو انہوں نے

نے جرمنی میں پسندہ سوہند و ستانیوں پر مشتمل آزاد ہند فوج کی تشکیل کی۔ آہستہ آہستہ فوج کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس میں جنرل شاہ نواز، تیسل خاں، اینفینٹ منیر الحق، میجر گورکھ سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ سہماش چندر بوس نے اس دور کی سیاسی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے برلن ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا۔

آج جبکہ برطانوی سلطنت معدوم ہونے کو بہت قریب ہندوستان کی آزادی کا سورج طلوع ہونے کو ہے۔ میں چکویہ دلدل ناچا بتا ہوں کہ ہندوستان نے سترہ سال میں اپنی آزادی کی پہلی بڑی بڑی ترقی دیکھی اور سترہ سال میں اس نے اپنی آزادی کی آخری جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی دیوی تباری منتر ہے۔ "خوب در آگے بڑھو فتح و نصرت تمہارے قدم چرمنے کو میناب ہے۔ تمہارا منہا ہے مقصود ہے آزاد ہندوستان کے لئے تھیں اپنی عزیز جانوں کی قربانی دینی ہے۔ نئے آزاد ہند کی تعمیر کرنا ہے جس کی کسی بیرونی طاقت کا عمل دخل نہ ہو، چوری آزادی ہو، جس میں ہر ہندوستانی کو اپنا مستقبل بنانے کی چوری آزادی ہو۔ آزاد ہند فوج کی بنیاد ایسے فلسفی نظام پر رکھی جائے گی جو انصاف، مساوات، اور اخوت کے پرانے اصولوں پر مبنی ہو۔"

اس سیاسی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:

میری تجویز کے مطابق انگریزوں کو بہت جلد ہندوستان چھوڑ دینا پڑیگا جیسے آجکل انار کی وریطو غنہ منہ کی بجائے تانبے کے دھڑ سے انار کی بدولت کچھ عرصہ تک باغی جنگ و جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس مارشل لوانٹ اٹلو کی کو موجودہ ذلت آمیز مہم پر ترجیح دینی چاہیے۔

ہندوستان میں انگریز کی حکومت کی جڑیں کھینچ لی جائیں گی۔ ہندوستان کے عوام اور سیاسی رہنماؤں کو اپنے خواب تعمیر آشنا ہوتے نظر آنے لگے۔ در انگریزوں کے میر ہندوستان سے لے کر انصاری سہماش کی تقریریں۔ ۲۔ ہندو عواموں کی تحریک ۱۹۴۰ء کی دینی بریں روبریں

اکھڑنے لگے اس صورت حال میں ۲۱ فروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ "حد و ہند آزادی کا مصنف لکھتا ہے۔۔

"برطانیہ نے آخر کار اختیارات ہندوستان کو سونپنے کا فیصلہ کر لیا۔ تفصیلات طے کرنے کے لئے جن میں فوری دو آئندہ دونوں قسم کی تفصیلات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ ایک کینیٹ مشن ہندوستان بھیج دیا۔ مختلف تنظیمیں اور پارٹیوں کے رہنماؤں سے طویل اور تفصیلی گفتگو کے بعد کینیٹ مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا جس کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے منظور کر لیا۔ لیکن بعد میں ان تجاویز کی توضیح میں اختلافات رونما ہو گئے۔ لیکن ویل کی ٹرمس نامی کردہ میانی مدت کی حکومت جلد اختیارات سنبھال لے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں کانگریس نے حکومت بنالی۔ جواہر لال نہرو مجلس وزراء کے سربراہ تھے۔ اکتوبر میں مسلم لیگ بھی کابینہ میں شامل ہو گئی لیکن انہوں نے آئین سازی کے کام میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ زیادہ سے زیادہ جون ۱۹۴۷ء تک برطانیہ ہندوستان کے اختیارات سونپ دے گا۔"

آزادی اور ملک کی تقسیم | لارڈ ماؤنٹ بیٹن اگست ۱۹۴۷ء ہی میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے حق میں تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک مصالحتی منصوبہ تیار کیا اور اختیارات کی منتقلی کو ایک سال اور قریب تر لے آیا۔ برطانوی حکومت نے بڑے غور و خوص کے بعد مایوس ہو کر ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کو ہندوستان کی تمام جماعتوں سیاسی، لیگی اور کانگریسی رہنماؤں نے منظور کر لیا اور ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کے ساتھ دو الگ الگ ملک ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔



تحریک آزادی



اُردو ناول

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہندوستان میں مکمل طور پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور انگریزوں کی انتظامی کارروائی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ جنگ کی ناکامی کے چند برس بعد سرسید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کی ابتداء کی اس تحریک میں، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، اور ذکا اللہ کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے اپنے میدانوں میں قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ حالی نے تنقیدِ محاری، شبلی نے تاریخِ نو لسی اور ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اردو میں ناول کا تصور مغرب کے اثرات سے آیا۔ اردو میں ناول نگاری کی باضابطہ ابتدا نذیر احمد کے ناول ”مرآۃ العروس“ سے ہوتی ہے۔

اس باب کی ترتیب میں صرف انہیں ناولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن میں سیاسی موضوعات سے بحث ملتی ہے اور آزادی کی مختلف تحریکوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ افسانوی ادب میں علوما براہِ راست جنگِ آزادی کا بیان اور سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال نہیں ملتا۔ البتہ الفاظ کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس کا احساس ہوتا ہے۔

اردو ناول نگاروں میں بھی حب الوطنی کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ تھی۔ انہوں نے اپنے فن کی حدود میں رہتے ہوئے اس جذبے اور تڑپ کا اظہار کیا ہے۔ اور اپنے ناولوں کے وسیلے سے قومی شعور کی بیداری میں جو رول ادا کیا ہے وہ نمایاں نہ ہوتے ہوئے بھی خاص اہمیت کا حامل

۶۰

۱۸۵۷ء کے بعد کے سیاسی حالات و کوائف کو مد نظر رکھتے ہوئے سہیل بخاری اپنی کتاب "اُردو میں ناول نگاری" میں لکھتے ہیں :-

"۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا تو ان کی معاشرت اور تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا چنانچہ اردو افسانہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اردو والے طبقے کی عام ذہنیت کا انقلاب ڈاکٹر نذیر احمد کے ناولوں کی شکل میں رونما ہوا۔"

۱۸۵۷ء کے بعد جب علی گڑھ تحریک کا قیام عمل میں آیا تو نذیر احمد بھی اس تحریک سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اس تحریک کے زیر اثر اصلاحی ناول لکھے۔ افتخار احمد صدیقی نذیر احمد کی ناول نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مولوی نذیر احمد معاشرتی شعور سے بہرہ ور اور زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر کے حامل تھے۔ ان کے قصے معاشرتی زندگی کی تصویر اور تفسیر بھی ہیں اور تنقید بھی مولوی نذیر احمد کے رجحانات و تصورات تقریباً وہی تھے جو سید احمد خاں کے رفقاء کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ اصل جذبہ اور محرک قوم کی اصلاح اور ترقی کا خیال تھا اور ان کے تمام قصوں میں مقصدی اور اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہیں۔ ان کی مقصدیت ایک خاص دور کے تقاضوں اور تحریکوں سے تعلق رکھتی ہے۔"

نذیر احمد حصولِ علم کو حصولِ آزادی کے لئے ناگزیر تصور کرتے تھے۔ ان کے اس قسم کے خیالات اور نظریات ان کے ناولوں میں مل جاتے ہیں۔ "بنات انگش" میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

"ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تو تم کو معلوم ہو کہ ابتداً ان لوگوں کی کیا تھی۔ نرے وحشی تھے ... رومیوں کی سلطنت تھی۔ انہیں سے انگریزوں

۱۔ سہیل بخاری "اُردو ناول نگاری" ص ۴۵۔ ۲۔ افتخار احمد صدیقی "بکولہ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ" ص ۴۵

نے غفل و سلیقہ سیکھا یہاں تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا^۱۔
 نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" اس دور کی سیاست اور معاشرت کا آئینہ دار
 ہے۔ اس ناول میں انہوں نے زندگی کے مسائل اور قومی زندگی کے رجحانات سے بحث کی
 ہے۔

معین عقیل اپنی کتاب "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" میں "ابن الوقت" کے بارے
 میں لکھتے ہیں :-

"نذیر احمد کے ناولوں میں "ابن الوقت" بہترین معاشرتی اور سیاسی ناول
 تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ابن الوقت میں خانگی زندگی سے بحث
 کرتے ہوئے قومی زندگی کے مسائل اور رجحانات سے بحث کی
 ہے۔ ابن الوقت میں فصل دوم سے فصل ششم تک جنگ آزادی کے
 واقعات اور اس کے عواقب کا بیان نذیر احمد کے عینی مشاہدے پر
 مبنی ہے۔ اس کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے حکومت
 کی کمزوریاں اور حکام کی زیادتیاں بھی کھلے لفظوں میں بیان کی ہیں^۲۔
 غدر کے سلسلے میں "ابن الوقت" کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے :-
 "غدر کے چوتھے دن کا ذکر ہے کہ ابن الوقت دو گھڑی دن رہے آخری
 کھیم روانہ کرنے کے بعد قلعے کی طرف چلا آ رہا تھا۔ ایک آپ تھا اور دو
 نوکر تینوں مسلح، اور ان دنوں جب دو آپس میں مذکور کرتے تھے تو بھی
 غدر کا مذکور ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی اس طرح کا تذکرہ کرتے چلے جاتے تھے
 جوں ہی عسکری خاں کے کمرے سے آگے بڑھ کر اُس کھلے ہوئے میدان میں
 پہنچے جو میگزین اور کالج کے درمیان میں واقع تھا، دیکھتے کیا ہیں کہ

^۱ نذیر احمد "ملت الغفل" ص ۱۸۲۔
^۲ معین عقیل "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" سلسلہ ۱۹۷۶ء ص ۵۴۔

کے بائیں طرف انگریزوں کی کچھ لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھ کر ابن الوقت کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اس وقت وہ موقع تھا کہ اکیلا کیسا ہی کوئی سوراکیوں نہ ہو ڈر کے مارے گھسلی بندہ جاتی... معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر بڑا سخت عذاب آنے والا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں غدر کے حالات و کوائف کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت عوام کے دلوں میں انگریزوں کی کتنی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں قومی نظریات و رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ نئی نئی تحریکوں نے جنم لیا۔ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) پہلی جنگ عظیم کا آغاز (۱۹۱۴ء) ہوم رول لیگ کی تحریک (۱۹۱۷ء)۔ ان سب کی بدولت یہ دور سیاسی و سماجی اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پریم چند نے اردو افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں باضابطہ قدم رکھا۔ پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں انہوں نے کم و بیش ایک درجن ناول تخلیق کئے جو اردو کے افسانوی ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

پریم چند کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس وقت سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ لوگ آزادی کے گیت گارہے تھے۔ گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی منظر نامے میں اپنا مقام بارہے تھے۔ پریم چند بھی گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ نتیجے کے طور پر پریم چند نے ملک و قوم کی خدمت کی غرض سے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں محنت کش عوام، مظلوم کسانوں اور متوسط طبقے کے افراد کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک فنکار تھے جنہوں نے سماج کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ افراد کی زبوں حالی اور مصائب کو بہت قریب سے دیکھا تھا ان کی نگاہ سائنٹفک اور معروضی تھی۔ پریم چند کی تصانیف اپنے عہد کے معاشی، تہذیبی

اور بالخصوص سیاسی زندگی کی ترجمان ہیں۔

”پریم چند کی ناولوں کا مواد ہمارے خاندانی، سماجی اور سیاسی سبھی قسم کے واقعات و حالات سے فراہم کیا گیا ہے۔“

آل احمد سرور پریم چند کی ناول نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :-
 ”پریم چند کے ناول سماجی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ ہر مسئلے پر ہمہ جہتی روشنی ڈالتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تاریخت کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی شامل رہتی ہے۔ وہ ہمیں ہمارے سماج کے ہر طبقے، ہر پیشہ اور ہر عمر کے آدمیوں، رسم و رواج، بود و باش کے طریقوں، خیال و عمل کی مختلف تحریکوں اور دیگر متعلقات حیات سے واقفیت کرا کے ہماری معلومات بڑھاتے ہیں۔ مقامی رنگ ان کے ناولوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے لکھتے ہیں۔ وہ یہیں کے ناولوں سے اپنی دکان بساتے سجاتے ہیں۔ مقامی رنگ مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں۔“

پریم چند کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا، سچان خیز تھا۔ عوام میں بڑی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ انقلاب روس، پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ، برطانوی اقتدار کے خلاف عوام میں بیزاری، محنت کش عوام کی زبوں حالی اور متوسط طبقہ کی بیداری، پریم چند نے ان تمام مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

پریم چند محبت وطن تھے۔ انہیں اپنے وطن کی ہر چیز سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا۔ ان کے ناول اپنے عہد اور خصوصاً بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے بہترین ترجمان ہیں۔ پریم چند کو اپنے وطن سے عقیدت تھی۔ ان کے ناولوں میں خباہتوں کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ پریم چند گاندھی جی کے ارادت مندوں میں تھے اور گاندھی ازم میں یقین

رکتے تھے۔ دیانرائن نگم اپنے ایک مضمون میں پریم چند کے تصورات کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”وہ سچے محب وطن اور کامل ادیب تھے اور فن میں کامل وہی شخص

ہو سکتا ہے جس کا دل وسیع، نگاہ بلند، طبیعت بے ریا اور نیت صالح

ہو۔ جو زبردست نہ ہو بلکہ ادنیٰ و اعلیٰ ہر ایک کا ہمدرد ہو۔ ہر حال

میں بے لوث رہ کر زندگی کے حقائق سے واقفیت رکھتا ہو۔“

حب الوطنی پریم چند کے رگ وریشہ میں بسی ہوئی تھی۔ عبد الماجد دریا آبادی پریم چند

کی وطن دوستی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”لوگ قہقہے کہانیوں کو محض لطف و تفریح کے لئے پڑھتے ہیں لیکن

اسکے لطف کے ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو تو بدی کی معافی راہوں کا علم،

شیطنیت کی چالوں کا احساس اور وطن کا صحیح جذبہ ایثار و خلوص اور

خدمتِ خلق کی ترست بھی اگر مد نظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار کونین

پریم چند کے دواخانہ میں ہی دستیاب ہو سکتی ہے۔ اور ہندوستان

میں تحریکِ وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس کے

بعد لکھے گا تو اسس کو تیس پینتیس سال کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں

گاندھی جی، موتی لال، داس، محمد علی، انصاری اور ابوالکلام آزاد

کی تقریریں اور تحریریں لازمی ہوں گی وہاں پریم چند کی تحریریں بھی ناگزیر

ہوں گی۔“

پریم چند نے اپنے ناولوں میں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی موضوعات پر قلم اٹھایا

پریم چند کی ناول نگاری کے حدود کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر مصین عقیل لکھتے ہیں:-

”پریم چند نے بلاشبہ اپنے ناولوں میں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی

پہلوؤں کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ ان کے ناول نہ صرف ایک خاص

عہد کے معاشرتی اور سیاسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ایک

خاص قوم کے مزاج اور مہجانات کے مبصر بھی ہیں۔ ان کے ناول کسی محدود اور مخصوص معاشرہ کے بجائے ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں، ان مختلف طبقات اور ان کے تہذیبی، سیاسی اور قومی مسئلوں، کشمکش اور انقلاب کے منظر میں ملے۔

پریم چند نے گاندھی جی سے متاثر ہو کر اور عدم تعاون کی تحریک کے زیر اثر ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی تحریک میں اپنی تحریروں اور ناولوں کے ذریعہ حصہ لیا۔ ”گوشہ عافیت اور ”میدانِ عمل“ گاندھی جی کے نظریات و خیالات کے نمائندگی کے لئے لکھے گئے۔ بالواسطہ طور پر پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعے گاندھی جی کے خیالات کو تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچانے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پریم چند گاندھی جی کے نظریات سے براہِ راست متاثر تھے۔ وہ اپنے ایک ناول ”جلوہِ اشار“ میں ایک کردار کی زبان میں کہتے ہیں:-

”مجھے ایک بیٹا دے دیو ماما۔“

دیو ماما نے پوچھا۔ جو بہت دھنواں ہو، بلواں ہو اور دنیا بھر میں شہرت حاصل کرے۔

لیکن ماں نے کہا، نہیں مجھے ایسا بیٹا دے جو وطن کی خدمت کرے۔^{۵۷}

پریم چند کے ناولوں میں ”گوشہ عافیت“ ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول کا زمانہ تصنیف ۱۹۲۲-۲۳ء ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں عدم تعاون، سول نافرمانی، کسانوں کی بغاوت اور کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا زمانہ تھا۔ اس ناول کا مخصوص موضوع کسانوں کی بغاوت جو انگریزی نظام کے خلاف وقتی تقاضوں کے مطابق تھی۔

پریم چند کے ناول ”میدانِ عمل“ میں اس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال اور عوام میں غیر ملکیتوں کے خلاف باغیانہ رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔ ”میدانِ عمل“ میں اس وقت کے ہندوستان کی سیاست اور حکمران طبقے کے مظالم کا ذکر بھی ملتا ہے

۱۔ معین عقیل ”تحریک آزادی میں اردو کا حصہ“ ص ۵۵۸۔ ۲۔ پریم چند ”جلوہِ اشار“ ص ۱۱۰۔

اس ناول کے تمام کردار انگریزوں کے مظالم اور غیر ملکی حکومت کے بے جا تسلط کے طلب گار ہیں اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سید طالب علی اپنے ایک مضمون میں گوشہٴ عاقبت کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”عدم تشدد، ترک موالات، اور ستیہ گره کی پوری تاریخ اس کے

صفحوں میں بند کر دی گئی ہے۔ ناول کیا ہے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک

کے ہندوستان کی تمام تحریکوں کی ایک پُر کیف داستان ہے۔“

پریم چند کا ایک اور اہم ناول ”چوگان ہستی“ ہے جو ۱۹۲۳ء میں تخلیق کیا گیا۔ اس کو پریم

چند نے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ یہ دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ

ناول بھی اپنے عہد کی سیاسی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ اس میں پریم چند نے مختلف کرداروں کی زبان

سے گاندھی جی کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔

چوگان ہستی میں رانی جانشہوی کا کردار بڑا اہم ہے۔ وہ اپنے لئے ایک ایسے بیٹے کے

خواہش کرتی ہے جو محب وطن ہو اور ملک و قوم کی خدمت میں اپنی جان تک قربان کر دے۔

وہ دانٹے کی موت پر تقریر کرتے ہوئے کہتی ہے:-

”میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے کوئی ایسا ہی

سپوت دیتا جو انہیں جاننازوں کی طرح موت سے کھیلتا جو اپنے

زندگی کو ملک و قوم کی خدمت میں قربان کر دیتا۔“

”چوگان ہستی“ میں آزادی سے قبل کے حالات سماجی اور معاشی پہلوؤں سے بحث لیتی ہے

اور گاندھی جی کی تحریکوں کی جھلک بھی اس ناول میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

”گنودان“ پریم چند کا معرکتہ الآرا ناول ہے جس نے نہ صرف اردو بلکہ پورے ہندوستانی

ادب میں اپنی اہمیت اور قدر و وقت کا لوہا منوایا ہے۔ اس میں اس دور کے سیاسی موضوعات

اور مسائل سے بحث ملتی ہے۔ گنودان کے کردار، آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں،

اور اپنے وطن سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ گنودان کے مندرجہ ذیل قہاس

میں اسی محبت اور عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔

”سمری اور بیلا دونوں صوبہ اودھ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہوری بیلا ری میں رہتا ہے اور رائے صاحب اگر پال سنگھ سمری میں۔ دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ پھلی ستیہ گرہ کی لڑائی میں ”رائے صاحب“ نے بڑا نام کمایا تھا کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل چلے گئے تھے جیسی سے ان کے علاقے کے آسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔“

معین عقیل ”گودان“ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-
 ”یہ ناول اپنے دور کے مختلف اقتصادی اور سیاسی انقلابات کو پیش کرتا ہے۔۔۔ اس کے کرداروں میں کسان، زمیندار، شہر کے باشعور افراد، قومی تحریک کے کارکن سبھی ہیں جو حکام بالادست سے نہیں ڈرتے اور ملک کی آزادی کے کو عملًا ظاہر کرتے ہیں۔“

یوسف سرمست نے اپنی کتاب ”بیسویں صدی میں اردو ناول“ میں پریم چند کے ناول کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ناول نگاری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے :-
 ”پریم چند اپنے عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات سے براہ راست وابستہ رہے ہیں۔ پریم چند نے ساحل سے طوفان کا نظارہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے طوفان کے تھپیڑے بھی کھائے ہیں۔“

پریم چند کی تصنیفات کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بھی حامی تھے۔ انہوں نے عملی طور پر مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ پریم چند نے قلم کی تلوار سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور آخر تک ان کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کرتے رہے۔
 پروفیسر احتشام حسین پریم چند کی انڈین نیشنل کانگریس نیز دیگر تحریکوں سے وابستگی کا

۱۔ گودان ۱۹۵۵ء ص ۱۷۔ ۲۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۶۰-۵۵۹۔

۳۔ یوسف سرمست ”بیسویں صدی میں اردو ناول“ ص ۲۷۔

ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”انڈین نیشنل کانگریس سے تو انہیں فکر کے ذریعے اہلی غذا ملتی تھی لیکن وہ دوسری سماجی و اصلاحی تحریکوں سے بھی غذا لیتے تھے۔ چنانچہ رانا ڈے وغیرہ کی سماجی اور اصلاحی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔“

موضوع کے اعتبار سے پریم چند کے ناول دو اقسام میں منقسم ہیں۔ پہلے قسم کے ناولوں میں ہندوؤں کے معاشرتی حالات اور مقاصد کی اصلاح کا عنصر ملتا ہے اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے اس قسم کے ناولوں میں جلوہ ایثار، بیوہ، بازارِ حسن، پردہٴ مجاز، ”غبن“ اور ”نرملہ“ شامل ہیں۔ پریم چند کے دوسرے قسم کے ناول موضوعات اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان میں معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

احتمام حسین ”تنقید اور عملی تنقید“ میں پریم چند کے نظریات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”پریم چند اپنے دور کے شعور کے ان پہلوؤں کے ترجمان میں جو غلامی پر آزادی کو، قدامت پرستی پر اصلاح کو، تنگ نظری پر بلند نگاہی کو، طبقاتی جبر و ظلم پر انصاف اور مساوات کو، سامراج اور آمریت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ ملک کی عوامی زندگی کو ابھارنے اور بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کے ترجمان تھے۔“

پریم چند نے حصولِ آزادی کو اپنی تحریروں کا مقصد بنایا۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

”ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن اس کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہو گا۔“

۱۔ احتمام حسین ”ذوقِ ادب و شعور“ ص ۲۱۹۔ ۲۔ احتمام حسین ”تنقید اور عملی تنقید“ ص ۶۹-۱۶۸۔ ۳۔ زمانہ، کانپور، پریم چند نمبر، ص ۷۲۔

پریم چند نے اپنی تحریروں، ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔
قومی شعور اور قومی تحریکوں میں ایک نئی روح پھونکی۔

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء

ترقی پسند تحریک کی جہاں ابتدا ہوتی ہے وہاں پریم چند کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ۱۹۳۵ء میں لندن میں عمل میں آیا۔ لیکن اس نے باضابطہ تحریک کی شکل ۱۹۳۶ء میں اختیار کی۔ اس انجمن کے قیام کے سلسلے میں سجاد ظہیر کا نام خاص طور پر سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں محمد زین تاثیر، محمد علی، ملک راج آنند اور جیوتی گھوش وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب آزادی کی جدوجہد اپنے شباب پر تھی۔

گوپال مٹل نے اپنی کتاب ”ادب میں ترقی پسندی“ آزادی کے ذیل میں لکھا ہے:-
”قومی آزادی کی جدوجہد اپنے آخری مرحلوں میں داخل ہو رہی تھی اور اس کی گمن گرج برکان تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی آواز بازگشت افسانوی ادب میں بھی سنائی دیتی تھی۔“

انجمن ترقی پسند مصنفین کا اصل محرک سجاد ظہیر ایک نوجوان تھا۔ اس انجمن کی پہلی کانفرنس ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو مکنٹوش میں منعقد ہوئی اور منشی پریم چند نے اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد پریم چند کا دور ختم ہو گیا اور ادب کی باگ ڈور براہ راست ترقی پسند مصنفین کے ہاتھوں میں آگئی۔ ۱۹۳۶ء کے ادب نے ایک نیا موڑ لیا۔ خیالات اور رجحانات اور نظریات میں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ اور جدید طرز کا ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مرزا سعید، اپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، رشید اختر، مدوی، رشید جہاں، فضل حق قریشی، اشرف صبر علی، انصار ناصر، ظفر قریشی، نجم الدین فکیب وغیرہ کا نام سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناول واقعات سے قطع نظر ایک خاص عہد کی عکاسی

اور معاشی انتشار اور اضطراب کے پیدائے ہوئے کرداروں پر مبنی ہیں۔ یہ کردار اپنے دور کے سیاسی انتشار کا عکس ہیں۔ ان کرداروں کے ذہن بے شمار اور مستقل الجھنوں کی آماجگاہ ہیں۔ یہ الجھن ان کے ماحول کی دی ہوئی ہیں۔ اور سیاسی نظریات، معاشی تصورات اور جنسی محرکات کی باہمی کشمکش اور تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ اس دور کے ناول نگاروں نے ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں دب کو تخلیق کیا۔ اس دور میں تخلیق کئے گئے ناولوں میں کرشن چندر کا ناول ”شکست“، سجاد ظہیر کا ناول ”لندن کی ایک رات“، عصمت چغتائی کا ”ٹیڑھی لکیر“ اور عزیز احمد کا ”گریز“ سلسلے آتے ہیں۔

کرشن چندر کا ناول ”شکست“ سسٹم کے بعد کے سیاسی بحران کا آئینہ دار ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں حب الوطنی اور وطن پرستی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی ملک کی خاطر جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں۔ لیکن ان سب حقائق کا اظہار براہ راست ناولوں میں نہیں ملتا۔

کرشن چندر کے ناول ”شکست“ میں شام ایک مرکزی کردار ہے۔ علی جو نائب تحصیلدار کی حیثیت سے سلسلے آتا ہے۔ شام اور علی جو کے مابین گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ شام کہتا ہے کہ آج کل سیاسی اعتبار سے حالات نسبتاً بدلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ عوام میں سیاسی بیداری پھیل رہی ہے۔

سیاسی بیداری ابی صاحب

جہاں پہلے جاگیردار لوٹتے ہیں، عوام تو ایک غیر منظم، منتشر قوت ہے۔ اسے سنبھالنا اسے استعمال کرنا، چند بھدار لوگوں کا کام رہا ہے۔ شروع سے چند لوگ بہت سے لوگوں پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ ہمیشہ سے، چاہے یہ حکومت جاگیردارانہ ہو یا جمہوریت یا آمریت۔

نیام صاحب ! بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب اصطلاحیں عوام کو گمراہ کر نیکی لئے، انہیں اپنے قابو میں لانے کے لئے گھڑی گئی ہیں۔

اس سلسلے میں ”شکت“ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

”علی جو کی باتوں سے ایک وحشی بے رحمی کی بُو آتی تھی۔ باتیں بڑی کڑوی تھیں لیکن اس میں صداقت ضرور تھی۔ حکومت چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو جبر و استبداد کے بغیر ایک لمحہ نہیں جی سکتی۔ چاہے یہ حکومت جمہوری ہو یا اشتراکی ہو۔ جبر و استبداد اس کی بنیاد ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ حکومت ہو۔ کیا انسان کی زندگی حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتی کیا ابھی تک انسان کو خوف کا احساس کرائے بغیر اس سے کوئی اچھا کام نہیں کروا جاسکتا اس نے سوچا اگر حکومت نہ ہو تو پھر کیا ہو، شاید انسانی سماج ایک جنگل بن جائے گا۔“

کرشن چندر کے خیالات اور نظریہ فکر سوشلسٹ تھے وہ جمہوریت اور مساوات میں یقین رکھتے تھے۔ کرشن چندر کی تمام تخلیقات ہندوستان کے سیاسی بحران دور میں تصنیف کی گئیں۔ اس دور کے ناولوں میں خلوص و یگانگت، حب الوطنی اور انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ پریم چند کے بعد اردو میں جواہر ناول نگار نظر آتے ہیں ان کا تعلق براہ راست ترقی پسند تحریک سے رہا۔ انہوں نے اس دور کے سیاسی حالات اور طبقاتی کشمکش کو دیکھا، پرکھا اور انہیں تجربات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے محرک اور روح رواں تھے۔ ان کا ناول ”لندن کی ایک رات“ ۱۹۳۷ء میں منظر عام پر آیا۔ جو ادبی سے زیادہ تاریخی اور سیاسی ہے۔

دقار عظیم ”لندن کی ایک رات“ کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

”اس ناول کا انداز سرتاسر فکری ہے اور اس فکری انداز نے ہندوستان اور اس کے باہر کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے۔“

خلیل الرحمن اعظمی ”لندن کی ایک رات“ کے کرداروں کا تعبیر یہ کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:-

۱۔ کرشن چندر ”شکت“ ص ۳۴۔ ۲۔ دقار عظیم ”داستان سے افسانے تک“ ص ۵۹-۱۵۸۔

”سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعے ہندوستان کے متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے نوجوانوں کی عکاسی کی ہے اور اس طور پر اپنے دور کے سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنا یا ہے۔“

”لندن کی ایک رات“ کے ہندوستانی کردار اپنے ملک و قوم سے محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اعظم اس ناول کا اہم کردار ہے۔ وہ لندن میں ایک مقام پر کھڑا جمیس کا منتظر ہے اچانک اس کی نگاہ سامنے لگے ہوئے چند اشتہاروں پر پڑی۔ اخبار میں جلی حروف میں لکھا تھا:

”بیکار مزدوروں کا پارڈ پارک میں جلسہ۔“

”دس انگریز سپاہیوں نے دس ہنر نیوز کو فساد کرنے سے روکا۔“

”ایک گورازخمی ہوا اور دہائیوز کی جان گئی۔“ بڑے بڑے کوئی ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ حروف میں کھمے ہوئے تھے۔ اعظم کا خیال یک لمحے کے لئے اپنے دوست کے انتظار سے بٹ کر ہندوستان واپس کی طرف گیا۔

”یہ کجمنت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔“ ”نیوز“ ہم نیوز ہیں اور یہ لالہ شنبے بندرجو اس ملک میں رہتے ہیں یہ کون ہیں؟

اعظم اور راؤ دونوں گفتگو کرتے جا رہے ہیں لیکن اعظم حسین کی وجہ سے بے چین تھا کیونکہ حسین وعدے کے مطابق نہیں پہنچ سکی تھی۔ اعظم چانک بولا۔

”راؤ تم نے آج کا اخبار دیکھا؟ ہندوستان میں پھر کہیں گولی

چلی۔“

اعظم نے کہا: ”نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا۔ مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ

روز کا دستور ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑے کھڑوں کے برابر ہے۔ اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا.....

خیال تو کرو ۲۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریزان پر مزیں سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت ہے! راؤ اور اعظم کی گفتگو جاری تھی کہ..

”اچانک راؤ کی آنکھوں کے سامنے ہندوستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی۔ دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار میٹوز کو فساد کرنے سے روکا۔ ایک گورازخمی ہوا اور ۱۵ میٹوز کی جان گئی ہے“

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”لندن کی ایک رات“ کے کردار اپنے ملک کو آزاد کرانے میں کس درجہ کوشاں ہیں۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کے تئیں بڑی محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

”لندن کی ایک رات“ کے کردار بے چینی اور کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں اور غلامی سے نجات کے طلب گار ہیں۔ وہ سماجی جکڑ بندیوں اور حکمران طبقے کی غلامی سے نجات پانا چاہتے ہیں اور آزاد زندگی گزارنے کے متمنی ہیں۔

ترقی پسند ناول نگاری میں عصمت چغتائی کا نام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ سماجی اور سیاسی ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی برائیوں کے ساتھ ساتھ معاشی بد حالی اور بے راہ روی ملتی ہے۔ میٹھی لکیر (۱۹۳۶ء) عصمت کا بہترین ناول ہے۔ عصمت نے ”میٹھی لکیر“ میں زندگی اور سماج کو موضوع بنا کر سیاست سے بحث کی ہے۔ اس ناول کے نصب آخر میں ہندوستانی سیاست سے خاص بحث کی گئی ہے۔ اس کے کردار اپنے وطن سے محبت اور سفید نام لوگوں سے نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے بڑا سجال انگیز زمانہ تھا۔ عصمت بھی ان سیاسی تحریکات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ انہوں نے اس کا اظہار

لیتے ناولوں کے ذریعے کیا۔

ٹیڑھی لکیر کے دو اہم کردار دشمن اور ٹیلر آپس میں ہندوستان کی سیاست پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ٹیلر کے الفاظ میں ٹیڑھی لکیر کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔
 ”ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوت میں ریل کے ڈبوں میں پورے زور خر و خش سے رونما ہوئی۔ سفید فام قوم کو کھلا حکم مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ نہیں مانگتے تم کو، ورنہ بیس جلد ڈالیں گے۔ ریل کی پٹریاں اکھیر دیں گے۔“

دشمن اور ٹیلر کے درمیان محبت ہونے کے باوجود دشمن کے دس میں سفید فام لوگوں کے لئے سخت نفرت ہے۔ اس کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ برابر کام کر رہا ہے۔ ایک سفر کے دوران دشمن اور ٹیلر میں سیاسی مسائل پر بحث ہو رہی ہے۔ دشمن اگست میں پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر کرتی ہے جو انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کا ایک جرات مندانہ اقدام تھا۔ اس ناول میں صفحہ ۱۲۱ سے لیکر ۱۴۱ تک اس دور کی تحریک آزادی کے تحریکوں سے بحث کی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

”آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور گرا سے رام کرنا ہے تو ایسی ایسی لاکھوں قربانیاں کرنی ہوں گی جو کچھ ان سر پھرے جوشیلے بچوں نے کیا وہ واقعی بہت معمولی نظر آتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہوا بے ترمیمی اور بد انتظامی سے ہوا اگر یہ قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا تھوڑا بہت حصہ ضرور ہاتھ آجاتا۔“

جس طرح پریم چند کا ناول گنودان ادب کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے اس طرح ٹیڑھی لکیر کو بھی عصمت کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔
 وقار عظیم عصمت کے تصورات اور فکر کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب داستان سے افسانے تک میں کہتے ہیں:-

”عصمت چغتائی“ ٹیڑھی لکیر۔ میں ۱۹۳۳ء۔

"عصمت چغتائی نے اپنے ذاتی مشاہدے کو گہری فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر نیر محی لکیر میں انجام دیا ہے۔ اب تک کوئی عورت ناول نگار انعام دے سکی ہے۔"

اس سلسلے کی ایک کڑی عزیز احمد تھے۔ عزیز احمد ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ وہ ممتاز افسانہ نگار اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ناول نگار بھی تھے۔ انہیں نے "گریز" ۱۹۴۲ء میں تصنیف کیا۔ عزیز احمد ناول کے میدان میں ہنیت اور تکنیک کے کچھ خاص تجربے کئے، اور اچھوتے موضوعات کو اپنے یہاں جگہ دی۔

وقار عظیم "داستان سے افسانے تک" میں گریز کی قدر و قیمت اور ہیئت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"گریز" عالمگیر جنگوں کے درمیان کے پُر آشوب یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔ اس میں اس عہد کے حقائق کا غلبہ ہے جنہیں مصنف نے مزے لے لیکر بیان کیا ہے۔ اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔"

"گریز" ایسے بیجان انگیز دور میں تخلیق کیا گیا جب سلطنتِ برطانیہ دم توڑ رہی تھی۔ ہندوستان سے انگریزوں کے پیر اکھڑنے لگے تھے۔ انگریز حکام تذبذب اور کشمکش کے عالم میں مبتلا تھے۔ دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی۔ ہندوستان بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ بایں ہمہ ہندوستان میں آزادی کا سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر معین عقیل اس دور کے سیاسی تناظر میں "گریز" کے بارے میں رقم طراز ہیں :-

"گریز" پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عہد کے سیاسی اور معاشی ماحول کا ایک منتشر ترجمان ہے۔ یہ یورپ اور انگلستان کے سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایک پر شور زمانہ کا عکاس ہے جسے پڑھ کر وہ سیاسی اور معاشی محرکات سامنے آتے ہیں جو یورپ کے زیر اثر اس وقت کے عالمی

مسائل تھے۔ اس ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں ضمنی نفسیات کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ جو دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ فساد کی زندگی کے انقلابات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے مرکزی کردار کو انھلستان کے دوران قیام میں پہلی بار نسلی امتیاز اور اپنے سیاسی محکومی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی "انتظامی حرکتوں" سے فراریت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس میں پورے یورپ اور اس کا سیاسی و اقتصادی و ضمنی اقدار کو ایک ہندوستانی کے نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار حکومت کا کارندہ تو ہے لیکن باطنی طور پر مضطرب، اور غیر مستحیض :-

بیمیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ اردو ناول نگاری میں نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر ترقی پسند ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے ذریعے براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے عوام میں آزادی کی تحریکوں کے تئیں گرمی پیدا کی۔ قومی شعور کو بیدار کیا۔ جس سے ہندوستانیوں کے عزم اور حوصلوں میں پختگی پیدا ہو گئی۔



تحریکِ آزادی



اُردو افسانہ

اُردو نثر کی دیگر اصناف کی طرح اُردو افسانوں نے بھی آزادی کی تحریک میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ اور ہندوستان کے عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے جس سے حریت پسندوں کے عزائم میں اس تحریک کے تئیں پختگی پیدا ہو گئی۔

اُردو میں مختصر افسانے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ افسانہ مغرب کے اثرات سے آیا اور بہت کم عرصہ میں نثر کی تقریباً تمام تخلیقی اصناف پر غالب آگیا۔ اور ادبی حلقوں میں مقبول ترین صنف ادب تسلیم کیا جانے لگا۔ اُردو افسانہ کی تاریخ میں پریم چند کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پریم چند افسانے کا رہنما ہے کیونکہ پریم چند نے افسانے کو فن دیا اور فن کی تعمیر بھی کی۔ لیکن پریم چند کو افسانے کا موجد کہنا مناسب نہیں۔ پریم چند سے قبل بھی مختصر افسانے کے نمونے مختلف رسائل میں مل جاتے ہیں۔ ان رسائل میں خصوصاً دل گداز، اودھ پنچ، خاتون، خدنگ نظر، محزن اغاظ وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ پریم چند سے قبل جن ادیبوں اور تخلیق کاروں نے مغربی افسانے کے فن اور اس کے تصور سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا ان میں خاص طور سے سجاد حیدر، یلدرم، سلطان حیدر، جوش، راشد الخیری، علی محمود بانگی پوری کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

دقار عظیم "نیا افسانہ" میں اُردو افسانے کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :-
 "ناول کی طرح افسانہ بھی اُردو میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ ناول اس

کے مقابلے میں ایک گننام چیز بن کر رہ گیا۔ مختصر افسانے کی ابتداء ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی اور قومی رہنما اس انتشار سے گھبرا کر ملک کی نئی تحریک پھیلا کر عوام میں اپنے مٹتے ہوئے تمدن کی محبت اور ان کی جگہ لینے والے ایک نئے نظام کی طرف سے محنت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

پریم چند کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ ادھوری اور نامکمل نظر آتی ہے۔ پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی معاشرہ پرانی قدروں کو چھوڑ کر نئے سماج میں قدم رکھ رہا تھا۔ مختلف قسم کی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پریم چند کی پہلی کہانی ”دنیا کا سب سے انمول رتن“ ۱۹۰۶ء میں ”زمانہ“ کا پور میں شائع ہوئی۔

افسانہ ”قاتل“ میں دھرم ویر ایک اہم کردار ہے جو ایک قوم پرست بھاکا کارکن بھی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں محبت وطن ہے اور اعتدال پسند ہے۔ وہ دھرم ویر کے انتہا پسند رویے کو پسند نہیں کرتی اور اس سبھا پر مختلف طرح سے اعتراضات کرتی ہے۔ دھرم ویر اپنی بوڑھی ماں سے کہتا ہے :-

”جو تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں، تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔“

بوڑھی ہوں، جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزا یاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص و انہماک سے خدمت

قوم میں مصروف تھی یہ

بوڑھی ماں اور دھرم میں گفتگو جاری ہے۔

دھرم ویرودہ (انگریز) ہندوستان سی وقت چھوڑیں گے جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج ہی سوراج مل جائے گا۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ سی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہے ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہوتا ہے اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں ہے۔

غرض کہ ابتدائے آخر تک افسانے میں دھرم ویر انتہا پسند اور جذباتی نظر آتا ہے اور پورا افسانہ حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہے۔

عزیز قاسم: افسانے کا سماجی و ثقافتی پس منظر میں لکھتی ہیں۔

”ملکی دین الاقوامی سیاسی تحریکیں اکثر افسانوں کا محرک ہیں۔ سیاسی تحریکیں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں، اس لئے افسانہ نگاروں کے مواد کو فراہم کرتی رہتی ہیں۔ سیاسی افسانوں کی ابتداء پریم چند سے ہی ہوتی ہے جن کی وجہ سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”سوز وطن“ حکومت نے ضبط کر لیا۔“

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مختلف تحریکوں کو لیکر آیا۔ نئے رجحانات سامنے آئے، اور سیاست نے نیا موڑ لیا۔ ہندوستان کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف خطے انتشار اور بے چینی کے عالم میں مبتلا تھے۔ سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ چین، ترکی، اور ایران میں بھی یہی صورت نظر آتی تھی۔ اسی دوران یعنی ۱۹۰۶ء میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا

قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کا رد عمل یہ ہوا کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ ادھر نوجوان طبقہ بھی متحرک ہو گیا۔ اسی سال ہندو مہاسبھا کی داغ بیل پڑی۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۸ء میں شامل پریم چند کی کہانیوں میں حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان سے بغاوت کی بڑا آتی تھی۔ جو انگریزوں کی جاہلانہ عملداری کیخلاف تھی۔ لہذا حکومت نے اس مجموعہ کو ضبط کر لیا۔ "سوز وطن" کی کہانیوں کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں:-

"کتاب نکلے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا (جو انگریز تھے) پروانہ پہنچا کہ فوراً مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں نے بیل گاڑی جتوانی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے "سوز وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟ میں نے کہاں ہاں: صاحب نے ایک کہانی کا مطلب مجھ سے دریافت کیا اور آخر میں بگڑ کر بولے تمہاری کہانیوں میں سیدیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریز عملداری ہے، مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔"

پس پریم چند پر باغی ہونے کا الزام لگا دیا گیا اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ حکومت اور خصوصاً کلکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی بھی کہانی شائع نہیں کر سکتے۔ "سوز وطن" پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" "شیخ مخمور"۔

”یہی میرا وطن ہے۔“ ”صلہ ماتم۔“ ”عشق دنیا“ اور ”حب وطن“ شامل ہیں۔ پریم چند ”سوز وطن“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

”ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ہندو دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشہ میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کی دگاہ بجز شقاۃ غز میں اور کچھ چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدید کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقیناً جوں جوں ہمارے خیال و قیاس ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔“

”سوز وطن“ کے افسانوں سے بغاوت کی بڑا آتی ہے اور ”حب الوطنی“ کے جذبات ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ ”دنیا کا سب سے انمول رتن“ اس جملے پر ختم ہوتا ہے۔ ”وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے

میں قیمت شے ہے:

”یہی میرا وطن ہے“ سوزِ وطن کا تیسرا اور سب سے چھوٹا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی حب الوطنی کا مرقع ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر کے اپنے وطن کے دیدار کی تمنا لے کر اپنے پیارے وطن کو واپس آیا ہے۔

”عشقِ دنیا“ اور حبِ وطن کا موضوع بھی حب الوطنی ہے۔ اس افسانے میں اٹلی کی محب وطن ”میری“ کی حسرت ناک زندگی کے چند عبرتناک مناظر کو بیان کیا گیا ہے، جو ہندوستانیوں کے دلوں کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔

سوزِ وطن کی کہانیوں میں ”صلہ ماتم“ کو چھوڑ کر باقی چار کہانیوں میں ہمیں ایک ایسے سچے درد مند اور پُرخص و عاشقِ وطن کی روحِ بھلتی اور تڑپتی نظر آتی ہے، جو وطن کی ہر چیز اور خصوصاً وطن کی آزادی کو والہانہ جذباتیت کے ساتھ ایک روحانی انداز سے دیکھتا ہے۔ وطن کی آزادی اور وطن کی محبت کے احساس پر اقتصادی اور معاشی اہمیت نے آگے چل کر جو غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کی جذباتیت اور روحانیت اس سے قطعی نا آشنا ہے۔ اس کے نزدیک وطن سے محبت کرنا اور اس پر اپنا تن من دھن بچھا کر دنیا انسانی فریضہ ہے۔

وقارِ عظیم ”داستان سے افسانے تک“ میں پریم چند کے افسانوں کی سیاسی اور قومی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عبد الماجد دریا آبادی کی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ہندوستان میں تحریکِ وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم آج سے سوچاں برس بعد لکھے گا تو اس میں تیس بیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری، اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔“

پریم چند محب وطن تھے انہیں وطن سے بے پایا محبت اور لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے غریب عوام ہوں یاد یہاں توں کے کسان، وطن کی زمین ہو یا وطن کا ماحول وہ اپنے وطن سے خاص انسیت اور محبت رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔ ہنسراج رہبر پریم چند کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔

”انہوں نے افسانوں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ وطن اور انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ بن سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دور تک ہندوستان سیاسیات میں تیزی سے تغیر پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ پریم چند نے بڑی لگن کے ساتھ اس تغیر کا ساتھ دیا۔ کانگریس سے تو انہیں اپنی فکر کے لئے غذا ملتی رہتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ دوسرے سماجی اور اصلاحی تحریکوں سے بھی اثر لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ رائے، گوکھلے، تلک، لاجپت رائے وغیرہ کی سماجی و سیاسی اصلاح کی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں و رز و روں میں واضح طور پر ملتا ہے۔“

پریم چند کے ان افسانوں میں جو خصوصاً جنگ آزادی کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ڈال کا قیدی، قاتل، آخری تحفہ، جیل، جلوس، آشیاں برباد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں آزادی کی تحریک اور تحریک ترک موالات کے واقعات بھی نظر آ جاتے ہیں۔ افسانہ ”لال قیتہ“ میں سیاہی تحریکوں سے متاثر ہونے اور سرکاری ملازمتوں سے عوام کے مستغنی ہونے کے واقعات ملتے ہیں۔ پریم چند کے اسی طرح کے افسانوں میں ”راج ہٹ“، ”منزل مقصود“ اور ”آہ بیکس“ شامل ہیں۔

افسانہ آخری تحفہ اس کے کردار سودیشی اور کشنگ کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس میں امر ناتھ اور مالتی دو اہم کردار ہیں۔ امر ناتھ محب وطن ہے وہ ان تحریکوں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ”جیل“ میں وشو مہر کا کردار زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ بی۔ اے کا طالب علم ہے اور اپنی تعلیم کی پروا کئے بغیر سودیشی تحریک میں حصہ لیتا ہے۔ روپتی

اس کی جرات اور حوصلے کو خوشش آمدید کہتی ہے اور اس کی تعریف کرتی ہے۔

افسانہ ”آشیاں برباد“ میں عورتوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار ”مرولا“ کی شکل میں پریم چند نے اس عورت کو پیش کیا ہے جو ظلم رسیدہ ہونے کے باوجود عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہے۔ اور آزادی کی جنگ میں شریک ہے۔ اس کا بیٹا، شوہر اور ماں جنگ آزادی کی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ اس کی بلند حوصلگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

”... ایک بارجی میں آیا بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں، سارا کنبہ ایک ساتھ، ایشور کے دیار میں جا پیچے۔ لیکن پھر میں نے سوچا تو نے ابھی ایسا کام ہی کونسا کیا ہے، جس کا معاوضہ یہ ملے۔“

اس افسانے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

”ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے، شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ... لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں۔ میدان سے جلتے نہیں۔ ہمیں اپنی بارزہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں۔ ... وہ (حکومت) یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں، اور حکومت کریں گے۔ تمہاری خوشی یا ناخوشی کی قوم کو پرواہ بھی نہیں، جلوس نکالنے کی مانگت کر دی گئی۔ ... آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں، جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت

اس مرتبے پر پہنچ گئی تھی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں ملتا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے ستھ کا نہ مظالم نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔ جلیا نوالہ باغ کا سانحہ، حکومت کا ناظمانہ اور وحشیانہ سلوک، ہندوستانیوں کی اہانت اور استعمار، یہ سب وہ امور تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ اور بیدار کرنے اور ان کے ارادوں کو معمم بنانے کی فضا پیدا کر دی۔ سارا ملک آزادی کی لہر میں آ گیا۔ مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو گئی۔ وطن کی محبت نے کروڑوں عوام کے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اخباروں نے مضامین کے ذریعے اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے آزادی کے جذبہ کو بیدار کیا۔

اس سلسلے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں :-

"اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود

نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے میں القوامیت سے ملائے اور اس

طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا۔"

پریم چند نے اپنی تحریروں اور خصوصاً افسانوں کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔ انہوں نے ایسے دور میں قدم اٹھا یا جب ہندوستان سیاست کی آگ میں جل رہا تھا۔ انگریز حکمران ہندوستان اور ہندوستان کے عوام کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پورا ملک افرا تفری کے عام میں مبتلا تھا۔ حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور ان کے ثواب شرمندہ تعبیر ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پریم چند نے ان تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے گاندھی جی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے سیاسی نظریات کو اپنے افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

۱۹۴۷ء میں پریم چند کی وفات ہو گئی لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں اردو انسان نگاری

لے پریم چند، آشیانہ برباد۔ تہ صبا، حیدرآباد اردو کاغذات نمبر ص ۱۹۔

میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی اردو ادب کی فضاؤں کو آج منور کئے ہوئے ہے۔ ان چراغوں سے بعد کے افسانہ نگاروں نے کسب نور کیا اور پریم چند کے خیالات و تصورات کی ترجمانی اپنے افسانوں کے ذریعے کی۔

اردو افسانہ پریم چند کے بعد | پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں میں ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ”انگارے“ کے پس منظر میں اس دور کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”بیسویں صدی کے اوائل میں اپنی ابتداء ہی سے افسانہ میں یلدرم کے ہاتھوں جس رومانیت اور پریم چند کے ہاتھوں مثالیت پسندی کے باوصف جس حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی تھی وہ الگ الگ باقاعدہ رجحان بن کر مستحکم روایتیں بن چکی تھیں۔ ”انگارے“ اور پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقی زندگی پر زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ سماجی انتشار، قومی اتحاد، سیاسی یکپارگی طبقاتی استحصال، امن کی خواہش غربت اور افلاس متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن محبت پر پابندی، بیکاری، جنسی گھٹن، ایشار، قربانی کی لگن، خاندانی زندگی کی ابتری، اور ایسے ہی دوسرے موضوعات سینکڑوں شکلوں میں افسانے بنے۔“

وقار عظیم ”انگارے“ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :-

”انگارے مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہے۔ انگارے کی کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی اور ان سب کی پیدا کی ہوئی عجیب و غریب شخصیتوں اور ذہنیوں کی تسکیمی تصویریں بھی جن میں رور عایت کہیں

نہیں اور آزادی اور بیاکی، خیال ہر جگہ ہے۔ ان کی مصوری میں تلخ
طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے۔ اور اس تلخ طنز میں کہیں
کہیں سنجیدگی اور ادبی اشاروں کے طرز کو چھوڑ کر تسخر اور ہنچلاہٹ
اور بعض جگہ ابتذال کی شکل اختیار کر لی ہے۔

انگاریے کی اشاعت کے فوراً بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ وہ دور
ملک میں قومی بیداری اور قومی شعور کا دور تھا۔ ملک کے سیاسی اور محاشی حالات اور برطانوی
عملداری کے سخت رویوں نے ادیبوں اور تخلیق کاروں کے احساس کو بھڑا دیا۔ قومی
سیاست نے بھی ہندوستان کی سیاست کو براہ راست متاثر کیا اور ادھر لوگوں کی توجہ
انقلاب روس، فاسزم اور اس کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے امکانات نے ہندوستان کے
عوام کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ یورپ اور امریکہ کے دانشور بھی ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔
اور متحد ہو کر عوامی تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ اس کے اثرات سے ہندوستان کے نوجوان،
جوان کلینڈ کی مختلف دانش گاہوں میں زیر تعلیم تھے۔ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان نوجوانوں
ایک ادبی حلقہ تشکیل کیا ان میں سجاد ظہیر، محمد دین تاشیر، محمد علی ڈکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر
جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی
کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۳۳ء لکھنؤ میں جو اعلان نامہ منظور کیا گیا اس کو ذیل میں نقل کیا جا رہا

ہے۔

”ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ
کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائے جائیں
گے، انہیں اختیار کریں گے۔

ہم اپنی انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو
بلدے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام
میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تمدن نے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم

چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچار، پستی اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور ارادوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کے ذریعے سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ انجمن کے مقاصد ہوں گے۔

- (۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاوری جیسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔
- (۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے — اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔
- (۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کرنا؛

انجمن ترقی پسند مصنفین نے ابتدائی سیاسی سیاست کے ساتھ براہ راست اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ بہت سے نوجوان ترقی پسند ادیب سیاست میں عملی حصہ لیتے تھے۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک کا ایک مقصد رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جدوجہد اور ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرنا تھا۔

سجاد ظہیر جو ترقی پسند تحریک کے محرک تھے انہوں نے ایک کتاب ”روشنائی“ کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ سجاد ظہیر ”روشنائی“ میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت ان لفاظ میں کرتے ہیں۔

”ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں، اور درمیانہ طبقہ کی جانب ہونا چاہیے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوشِ عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی و جدوجہد اور وطن کے عوام کو اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ میں۔ صرف دور کے تماشائی نہ ہوں۔ ترقی پسند ادیب کے دل میں نونا انسان سے انس، اور گہری بھمدردی ضروری ہے۔ بغیر انسان دوستی، آزاد خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم اعلانیہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ آزادی اور جمہوریت کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور غریب کسانوں اور مظلوم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔“

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں ترقی پسند تحریک کا مقصد نزولِ حالی اور درمیانہ طبقہ کی حمایت، سماجی استحصال کی مخالفت اور سماج میں پھیلی ہوئی بے چینی کو دور کرنا تھا وہاں اس کا ایک اور اہم مقصد انگریزوں کی مخالفت اور آزادی کی حمایت تھا۔

انجمن کی کل ہند کانفرنس دوسری جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء میں دہلی میں منعقد ہوئی ترقی پسند مصنفین جمہوری حقوق کی حمایت میں اپنی آواز بلند کر چکے تھے اس اجلاس میں ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی گئی اور اس قرارداد میں کہا گیا کہ ”ہم برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ ان

نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔
 حسرت موہانی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی اجمیت اور اس کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہمارے ادب کو قومی آزادی کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیے اور عام مفلسوں انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنی چاہیے۔ اس میں عوام کے ذمہ شکرہ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد اور منظم ہو کر اپنی انقلابی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔“

پریم چند کی افسانہ نگاری اور انکسار سے ”کی ساخت کے بعد ترقی پسند تحریک نے بھی اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے سماجی سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سدرشن، اعظم کرپوری، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کے نام خاص ہیں۔

افسانہ نگاروں میں پریم چند کے بعد سب سے زیادہ معتبر نام کرشن چندر کا ہے کرشن چندر نے ناول اور افسانہ دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے افسانوں میں خوبصورت منظر، فطرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماج کی تلخ حقیقتوں نیز سیاسی عارت و واقعات کی بھرپور تصویر کشی ملتی ہے۔ معین حقید نے کرشن چندر کے موضوعات اور رجحانات کے بارے میں لکھا ہے:-

”کرشن چندر کے تعدادی رجحانات کے زیر اثر جنگ، سامراج و فاشیت بھی موضوعات بنے ہیں اور ان کی موضوعات میں سماجی معاشی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ ایک مخصوص سماجی اور سیاسی ماحول میں رد کر یک مخصوص نظریے کے تحت انہوں نے افسانے لکھے ہیں۔ انکی

تحریروں میں بھی جو ماحول ملتا ہے وہ سیاسی طور پر غلام و رسوا کی طور سے
 پس ماندہ ہے اور ان دونوں کے سبب انگریز قوم و سرمایہ دارانہ نظام میں
 ہر طرف بھوک ہے، قحط ہے اور غارتی ہے۔ ہر افسر ایک نظام اور سٹاکٹ
 افسر ہے۔ جسے اس ملک کے عوام سے کوئی مدد دی نہیں۔ یہ تو کمرشن
 چندر کو سب دوستی و رسوا کی رستوں کو سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ جہاں انکی
 انسان دوستی بعد میں گئی سے کہی رومانی فضا میں بھی انسانیت کی
 آزادی کے پرچم کو بلند رکھتی ہے۔ وہ اپنے رومانی انداز میں انسانیت
 کی آزادی و رعیت کی آزادی کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ جب وہ رسوا
 رشتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس بڑی حد تک طاقت کے خلاف آواز
 اٹھاتے ہیں جس نے زندگی اور فطرت دونوں ہی کے تسنیر قبضہ کر لیا
 تھا۔ کمرشن چندر نے انسان دوستی اور غلامی کے خلاف شدید نفرت
 کے انہار سے انسان کی آزادی و رومندستان کی آزادی کے پرچم
 کو ہمیشہ بلند رکھا ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد افسانہ نگاروں نے جو نئے نئے تخلیق کئے ان میں کمرشن چندر کا "فسانہ" دو
 "بلانک لمبی سڑک" احمد علی کے "فسانے" "ساری گلی" اور "میر کدہ" "منشور کا نیا قانون"
 حیات اللہ انصاری کا "فسانہ" "آخری کو ستمش" "مونیٹ" اور فن کے اعتبار سے بہترین "فسانے"
 تصور کئے جاتے ہیں۔

ان سے ذرا آگے بڑھ کر احمد ندیم کاشمی، غلام عباس، برہیم حبیب، اختر اور بنوی
 حسن عسکری، بلونت سنگھ، یندر، تھ، شک و راجہ احمد عباس کے نام بڑی اہمیت
 کے حامل ہیں۔

احتمام حسین اس دور کے دیوبند کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے "ردایت اور بنو"
 میں لکھتے ہیں:-

”اس زمانہ میں اردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دکھی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے۔ فرقہ واریت انگریز سیاست کی ناجائز اولاد ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اگر ہندوستان کی تقسیم ہونا ہی ہے تو بہاؤ گاندھی کے الفاظ میں اس کی تقسیم اس طرح ہو کہ جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں سے نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کا نتیجہ ہو۔“

پریم چند اور کرشن چند کے بعد افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک اور معتبر نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ منٹو ایک اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار تھا۔ اس کا فنی شعور اور اصابت فکر، رجحانات اور خیالات اپنے معاصرین سے مختلف ہیں۔ ایک طرف منٹو نے جنسی مسائل اور معاملات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے تو دوسری طرف اپنے عصری سیاسی مسائل سے بھی باخبر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سیاسی مسائل سے بھی بحث کرتا ہے۔

معین عقیل منٹو کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”منٹو کا فنی شعور افسانہ نویسی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ ان کے عام افسانوں میں طوائف کی زندگی اور جنسی الجھنوں سے دوچار نوجوانوں کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے مناظر، سیاسی جلسے، جلوسوں پر پولیس کی گولہ باری، گلیوں بازاروں میں مسلح فوج کا راج، جیل خانے، مارشل لا، بغاوت کو ختم کرنے والی برچھیاں اور گولیاں، ایک نئے قانون کی خواہش، انقلاب کے نعروں کی گرما گرمی جیسے موضوعات بکثرت ملتے ہیں۔ ان کے بے شمار موضوعات میں خصوصیت ہے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی منظر کشی ہے۔“

منٹو نے ایک خاص دور کے سیاسی معاملات و کوائف کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کے جن افسانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جو سیاسی حالات کے مکمل طور پر ترجمان ہیں۔ ان میں ”نیا قانون“، ”نعرہ“، ”شرابی“، ”تماشا“، ”ماچی جلسہ“، ”دیوانہ شاعر“، ”سوراج کے لئے خاص ہیں۔“

لے اشتہار حسین ”عدایت اور بغاوت“ ص ۱۷۹۔ لے تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۳۷۔

منٹو کا افسانہ "تماشہ" ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے منگاموں کو پیش کرتا ہے۔ "شرابی" اس کے بعد کے واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں منٹو نے تحریک عدم تعاون کی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز اور صورت حال کو پیش کیا ہے۔ افسانہ "شرابی" کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں۔

"آہ آزادی۔ خیر معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہوگا۔ ان آزاد لوگوں کی حالت پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے۔۔۔ اس کا جواب مجھے نہیں ملتا۔"

افسانہ نگار اپنی غلامی، بے بسی، اور مغلوبی کا احساس اس طرح بیان کرتا ہے۔

"قصور وار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی تلوار لے کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ ہندوستان کے ۲۵ کروڑ باشندے اپنی چھپی ہوئی آزادی حاصل کر لیتے اگر ظلم کا سٹا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے موتا۔ وہ ڈراتے ہیں درہم سائے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضو ان کے ظلم سے مغلوب ہے۔۔۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس مڈی دل پر کتنے لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ آپ ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔۔۔ حاکم ہرگز ملعون و ملعون نہیں ہو سکتے ہمارا وطن خوف میں بیٹا ہوا ہے۔ اس دھند کو دور کر دیجئے پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی۔"

منٹو کے افسانے "نیا قانون" کا مرکزی کردار منگو کو جو ان ہے۔ جو غیر علیم یا متہ ہونے بھی عصری حالات سے باخبر اور سیاسی طور پر بیدار نظر آتا ہے۔ منگو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ افسانے میں ایک جگہ منگو انگریزوں کے بارے میں کہتا ہے

"(انگریز) آگ لے آئے تھے، بگھر کے مالک بن گئے، ناک میں دم کر رکھا

ہے ال بندوں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھنے میں گویا ہم اس کے باوا
کے نوکر ہیں۔

پروفیسر محمد محسن اپنی کتاب ”منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں“ ملک کے سیاسی مناظر کو جس نظر
رکھتے ہوئے منٹو کی فسانہ نگاری کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں۔

’ملک میں آزادی کی لہر تیرنا سے پھیل رہی تھی، ملک کی غلامی کو غربت،
جہالت، بے روزگاری اور ساری دوسری اقتصادی و اخلاقی گراؤوں کا
سبب قرار دیا جانے لگا تھا۔ منٹو بھی ان عصری تقاضوں سے متاثر ہوا
اور اس نے چند اچھے افسانے بھی لکھے جن کا مقصد سیاسی اور سماجی بیداری
کی لہر کو ہوادے کر غوام کے دلوں میں لغات کے جذبات کو بھرکانا
تھا۔‘

منٹو نے یہاں ایک طرف اپنے افسانوں میں محسوس مسئلے کی دہاں انہوں نے
آزادی کی تحریکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے افسانوں میں جلیانوالہ باغ کا دہشتہ، احتجاجی جلسے،
آزادی کے متوالوں پر مظالم اور آزادی کی ٹرپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ منٹو کے اس طرح کے
افسانوں میں ”نیا قانون“، ”نفرہ“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ”ٹوپہ ٹیک سنگھ“ اور
”سوتری“ ہندوستان کی تقسیم پر ایک فکرا نہ طنز ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانے سیاسی اور سماجی ناہمواری
بے راہ روی اور نا انصافی پر ان کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی
کے افسانوں میں ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست کے بھی گہرے اثرات
نظر آتے ہیں۔

بقول معین عقیل۔

”احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے وہ بڑا وسیع ہے
اس میں زندگی کچھ محدود نہیں۔ اس کی معاشرتی، اخلاقی اور معاشی زندگی
پر ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست اور معاشیات کا اتنا گہرا رنگ

۱۔ منٹو افسانہ ”نیا قانون“ ۲۔ محمد محسن ”منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں“ صفحہ ۱۲۱۔

چڑھا ہوا ہے کہ انہیں مجروح حالت میں دیکھنا ممکن نہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کے مخصوص روحانی مناظر اور اس کی زندگی کی روح و مرکز چوہیاں کے علاوہ انقلاب زمانہ، عصری تحریکات خصوصاً خلافت تحریک، انقلاب و آزادی کی جدوجہد، ایسے موضوعات ہیں جن کا افسانوں میں گہرا عکس موجود ہے۔

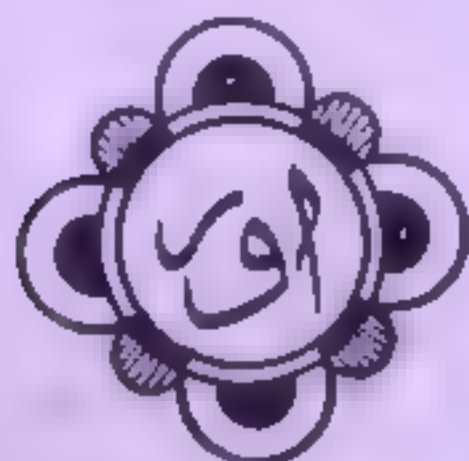
احمد ندیم قاسمی نے خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں کی روحانی فضا کو اپنے افسانوں میں بکھری ہے۔ انہوں نے ایشہ دور کی تحریروں، خصوصاً آزادی کی جدوجہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کا افسانہ "ہیر و شیما سے بیٹ" اور "ہیر و شیما کے بعد" دوسری جنگ عظیم کے عرصے و کوائف کے پس منظر میں تخلیق کیا ہوا ہے۔

ابراہیم جلیس نے بھی سیاسی عمارت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے غیر ملکی ناجائز سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کا نعرہ لگایا۔ وہ ملک میں پھیلی ہوئی معاشی بد حالی کا ذمہ دار بھی انگریز کو قرار دیا۔ جلیس کے "س طرح کے افسانوں میں" چالیس کروڑ بھکاری، "رذیل"، "زرد چہرے"، "تکڑا دیس"، "بند دستن جھوڑو"، "اونچی ایڑی کی گرگابی"، "میں امن نہیں چاہیے"، "بنارس کی ساری"، "عید"، "تیری اور میری آنے والی نسل" ایسے متعدد افسانے ہیں جن میں انگریز عملداری کے ختم و استبداد، فرقہ واریت، کسانوں کے استحصال کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور جو اپنے عہد کے سیاسی و معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

بمبشت مجموعی پریم چند سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اردو کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں نے عصری سیاسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔



تحریک آزادی



اردو ڈرامہ

اُردو کی نثری اصناف میں ڈرامہ بھی ایک مقبول صنفِ ادب ہے۔ اگرچہ اُردو میں ڈرامے کی روایت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ عشرت رحمانی کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ :-
 ”ڈراما یونانی زبان کے لفظ ڈراما سے مشتق ہے جس کے معنی میں عمل یا ایکشن، ہر ملک اور ہر زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر مانا گیا ہے۔ قدیم زمانے سے سیکر آج تک فنی اصطلاح میں ڈراما کا اطلاق اس صنفِ ادب پر ہوتا ہے جس کے الفاظ میں گفتار کی متحرک قوت اور کردار میں عمل اور ارادہ کی کیفیت موجود ہو۔ عملی تجربات کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے کہ ”ڈراما“ ادبیات عام میں منفرد صنف ہے۔“

ڈرامے کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں پارسیوں کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے لیکن ان کا مقصد خالص تجارتی تھا۔ اس لئے ابتدائی ڈراموں میں ملکی و قومی مسائل سے بحث اور سماجی کشمکش نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تخلیق کئے ہوئے ڈراموں میں ملکی اور قومی جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ڈرامہ کا ایٹیم سے گہرا تعلق ہے اس لئے ڈرامہ اور ایٹیم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ ایٹیم کے بغیر ڈرامہ کا تصور ممکن نہیں۔ موجودہ دور میں ڈرامے ایٹیم کرنے کا رواج کم ہوتا جا رہا

ہے اس لئے ڈرامے بھی کم تخلیق کئے جا رہے ہیں۔

موضوع زیر بحث کے تعلق سے انہیں نمائندہ ڈراموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں قومی اور سیاسی شعور زیر بحث رہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں اس دور کے سیاسی حالات سے بحث اور ملک میں قومی شعور کی بیداری کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۵۷ء کے بعد جن ڈرامہ نگاروں نے خاص طور پر مقبولیت اور شہرت حاصل کی ان میں آرام، رونق بنارس، حافظ عبداللہ، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی اور احسن کھنوی کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

عشرت رحمانی "اردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید" میں ۱۹۵۷ء کے بعد کی ڈرامہ نگاری کا سیاسی پس منظر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں طویل سیاسی جدوجہد کے دوران کئی ڈرامہ نگاروں نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے تخلیق کئے۔ یہ ڈرامے عصری سیاسی تقاضوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے تھے۔ ان میں سیاسی جذبات و احساس اور شعور عام نظر آتا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کا انہار اور قومی بیداری کے مقاصد معلوم ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور اس زمانے کی تھیٹر کمپنیوں نے جگہ جگہ انہیں اسٹیج کیا۔ ان میں سے بعض ڈراموں کے سلسلے میں حکومت نے کئی کمپنیوں کے خلاف کارروائی بھی کی۔ بھاری جرمانے کئے اور کمپنیاں ضبط ہوئیں۔"

"تحریک آزادی میں اردو کا حقہ" میں معین عقیل لکھتے ہیں :-

"بعض ڈراموں میں محض سیاسی واقعات و حالات پیش کئے گئے ہیں اور بعض میں کھل کر برطانوی مظالم، سیاسی جبر و استبداد اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کو دکھایا گیا ہے اور چند ڈراموں میں آزادی کی اہمیت، جموں آزادی کی ترغیب اور برطانوی حکومت سے نجات جیسے موضوعات اور

خیالات بیان کئے گئے ہیں۔

اُردو میں تو متعدد ڈرامے تخلیق کئے گئے لیکن سیاسی ڈراموں میں اُردو کا پہلا ڈرامہ "فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت" سمجھا گیا۔ عبدالعلیم نامی نے اس ڈرامے کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ:-

"اُردو میں سیاسی موضوعات پر پہلا ڈرامہ "فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت" ہے جو ۱۸۵۷ء میں بمبئی میں پیش کیا گیا۔"

"فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت" کے بارے میں کوئی مزید معلومات فراہم نہیں ہو سکی۔ اس کے کافی عرصہ بعد ۱۸۹۳ء میں امر دُعلی ٹھنوی نے لہٹ بن کے نام سے ایک ڈرامہ تخلیق کیا۔ اس ڈرامے میں ابتدا سے آخر تک برطانوی حکومت کے مظالم، جوہر دستہ اور جبر و استبداد کو دکھایا گیا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو کس کس طرح اپنی فریب کاریوں سے غلام بنائے رکھا اس داستان کو بھی دہرایا گیا ہے، اور انگریزوں کو تکبر، متعصب اور ظالم قرار دیا گیا ہے۔ اسکے کرداروں میں مسٹر بارش، مسٹر پوجوڈس، مسٹر اینگر، مسٹر براؤڈ، کو سم باسنی دکھایا گیا ہے۔ ڈرامہ کے آخری حصہ میں ہندوستانیوں کو شرف رو اور فتیاب دکھاتے ہوئے ترمیم شدہ "البرٹ بل" والسر اے کی کونسل منظور ہونے کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اُردو کا اہم ڈرامہ مولانا ظفر علی خاں نے "جنگ روس و جاپان" تصنیف کیا تھا۔ اس ڈرامے کے بارے میں معین عقیل رقمطراز ہیں:-

"یورپ کی آخری، بیسویں صدی کی جنگی حکمت عملی کو مرض جوڑا مرض" قرار دیا ہے۔ ظفر علی خاں نے جاپانیوں کی قوم پرستی کے ذکر سے ہندوؤں کو سبق حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس میں ایسے کردار پیش کئے گئے جو ہندوستانیوں کے لئے مثالی ہو سکتے ہیں۔ ضعیف، بیوہ ماں کا محض اس خیال سے خودکشی کرنا کہ اس کے بعد اس کا لڑکا مال کی خدمت کے بجائے ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔ اور اس نوجوان کا دھیان صرف ملک و قوم کی خدمت کی طرف رہے۔ طفل مکتب کا مدرسہ کے اوقات

لے معین عقیل "تحریک آزادی میں اُردو کا مقام" ص ۵۸۔ عبدالعلیم نامی "اُردو تھیٹر" ص ۱۰۰۔

کے بعد مٹھائی بچکر جنگی فنڈ میں روپیہ دینا محکوم ہندوستانیوں کے لئے مشعل
راہ ہو سکتا تھا۔ اس ڈرامے کے ذریعے یورپ کے مقابلہ میں ایشیا کی
برتری کے احساس کو بیدار کرنا بھی تھا۔ جو فی الواقعہ جاپان کی روس
کے مقابلہ میں فتح ۱۹۰۵ء کے بعد ایشیا میں پیدا ہو رہا تھا۔

اس کے علاوہ متعدد ایسے ڈرامے تخلیق کیے گئے جن میں حب الوطنی اور ملک و قوم کی
خدمت کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے۔ مثلاً اصغر نظامی کے ڈرامے "قومی دلیر" سے ہندو مسلم
اتحاد و یگانگت جھلکتی ہے۔ عبدالطیف نے "ہمارا گھر" تصنیف کیا تھا۔ اس ڈرامہ کا مرکزی
کردار ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں سے بے پایاں محبت کرتا ہے۔ اور قومی یک جہتی و یگانگت
میں یقین رکھتا ہے۔ وہ اپنا تمام سرمایہ سوانح اور خلافت فنڈ کو دے دیتا ہے۔ اسی طرح عباس
علی نے "لیڈی جونٹی" اور شاہی فرمان عرف دلش اپدیش "تخلیق کئے۔ آخر الذکر ڈرامے کا
مرکزی کردار رام ناتھ اخبار "ہندو درپن" کا ایڈیٹر ہے۔ رام ناتھ انگریزوں کی بدعنوانیوں اور
حکومت ہلی کی خامیوں پر تنقید کرتا ہے۔ عشر انبالوی کا ڈرامہ "غریب ہندوستانی عرف القربانی
سودیشی تحریک" ہے۔ انہوں نے اس ڈرامے میں ہندو مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل کو حل
کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے کردار ہری پانڈے اور شیو پانڈے ہندوؤں کی نمائندگی
کرتے ہیں اس طرح کے موضوعات پر ریاض دہلوی نے "مسلم بھاری" میں اور نصیر انبالوی نے "وطن"
میں پیش کئے ہیں۔

دل لکھنوی کا ڈرامہ "تاج محل" ہندو مسلم یگانگت اور یک جہتی پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے
ڈرامے "وطن" میں ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا ہے۔ شمس لکھنوی کے ڈرامے
"مادر وطن" اور "حب الوطن" خاص ہیں۔ انہوں نے ان ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات
کو نمایاں کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وطن کی محبت ہر ہندوستانیوں کا فرض ہے اور غلامی سے
نجات کے لئے ہندوستان کے ہر فرد کو جدوجہد کرنی چاہیئے۔

محی الدین عزم کا ڈراما "دیشس کی پکار" ایک اہم ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے
انہوں نے ہندوستانی عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ "گوثر افلاک
لہ میں جیل" تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۵۹۰۔

عرف خون حسرت کے عنوان سے وحشت دہلوی نے ایک ڈرامہ تصنیف کیا تھا۔ اس میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی ہے۔ وحشت دہلوی نے اس ڈرامے میں سرمایہ داروں کے مظالم اور عوام کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔

”بیداری“ اظہر دہلوی کا اہم ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں آزادی کی تحریکوں کا پورا سیاسی تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً تحریک عدم تعاون کی حمایت، تحریک خلافت، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، مارشل لا، سودیشی تحریک کے مختلف واقعات اور ان کے عواقب بیان کئے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے اور قربانیاں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مثال کے طور پر اظہر دہلوی کے ڈرامے ”بیداری“ کے چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

”امرت جلیانوالہ باغ کی زمین الازار بنادی گئی ہے۔ بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی خلافت پارہ پارہ کر دی گئی اور ان کی قریاد مطلق نہیں سنی گئی۔“

بخٹی: ”بے شک عدم تعاون ہی ہمارے درد کا علاج ہے۔ عدم تعاون کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک کہ تھان جلیانوالہ باغ کو عبرت انگیز سزا نہیں دی جائے گی۔ اور جب تک خلافت کا فیصلہ مسلمانوں کے خیال کے مطابق نہیں کیا جائے گا۔“

امرت: ”مگر یہ باتیں سوراخ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔“
بخٹی: ”بے شک نہیں ہو سکتیں۔ اسی لئے کانگریس اور مسلم لیگ نے سوراخ کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔“

سردار جعفری کا ڈرامہ ”یکس کا خون ہے“ پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں ہندوستانیوں کی جدوجہد، شجاعت اور بہادری کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بھیم اور ارجن، اکبر اور میو، جھانسی کی رانی، اور بھگت سنگھ کی روح ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ڈراموں کا ایک مجموعہ "نئی تصویریں" سجاد ظہیر نے مرتب کیا تھا ان ڈراموں میں "ہیلڈرک" ہے جس میں دوسری جنگ عظیم کے واقعات ہندوستان کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا ڈرامہ "مارشل ٹونکو" ہے اور تیسرا ڈرامہ "لال بھٹا" ہے۔

لاکشن چندریا کا ڈرامہ "شہید وطن" موتی لال نہرو کی زندگی پر محیط ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ موتی لال نہرو اپنے پورے خاندان کے ساتھ اپنی زندگی ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں۔ شہید وطن کے پہلے میں یہ اشعار درج ہیں :-

پرورش کیا کیا کیے گو بر زمین ہند نے
کیسے کیسے لال اگلے سر زمین ہند نے

روشنی خورشید نے لی جن کی آب و تاب سے
ہے غلامی کو بھی سکتہ جن کے رعب و داب سے

نور الہی محمد عمر کا ڈرامہ "روح سیاست" پنڈت نہرو اور ابراہیم لنکن کی سیاسی جدوجہد پر مشتمل ہے اس میں دونوں کی ملکی، سیاسی اور ملی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔

اشتیاق حسین قریشی کا ڈرامہ "نقش آخر" جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مبنی ہے۔ ڈرامہ کامرزی کردار میر عاشق، رشیدہ، محسن اور دیگر لوگ گنگو میں منہمک رہے ہیں۔ نرگس (میر عاشق کی خانہ زاد) داخل ہوتی ہیں اور خبر دیتی ہے،

"حضور چھوٹے سرکار (میر ناصر) تشریف لائے ہیں۔"

میر ناصر اندر جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"سنا ہے کہ انگریزوں نے پورے ہندوستان کو کرسٹان بنانے کی

ٹھان لی ہے۔ کار تو سول پر چربی لگائی ہے اور ہندوستانیوں کو اسے

منہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ تنگوں نے بغاوت کا ارادہ کر لیا ہے۔"

میر عاشق اور میرزا ناصر میں گفتگو جاری ہے۔ میرزا ناصر کا کہنا ہے کہ انگریزوں کی ایسی سیاہ نے بغاوت کر دی ہے اور وہ دہلی کی طرف بہادر شاہ ظفر کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

”ان باغیوں نے جہڑکوس کے نیچے پھنک کر پیسے بھلے اور باقاعدہ فوجی سلامی ادا کی۔ جہاں پناہ دے حکیم حسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ ستفسار جا کر یہاں درپون ہیں کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ اس پر ان کے افسر آگے بڑھے اور ہاتھ جوڑ کر تقریر کی جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں نے ان کے دین و دامن میں مداخلت شروع کر دی ہے اس وجہ سے وہ بغاوت پر مجبور ہیں۔“

”نقشِ آخر“ میں ۸۵ء کے انقلاب کا پورے تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور خصوصاً مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو تاخت و تاراج ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ نیز مسلمانوں میں قومی، سیاسی و تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے بھی بعض اہم ڈرامے تخلیق کئے۔ انہوں نے مقصدی و راصدق ڈراموں کے علاوہ تاریخی ڈرامے بھی لکھے۔ پروفیسر مجیب کے ڈراموں میں ”آزاد کش“ قابل ذکر ہے۔

مجیب صاحب کا ڈرامہ آزادی ہند کے بعد یعنی جولائی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ اصلاً یہ ڈرامہ ۱۹۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کو پڑھنے کے بعد ہندوستان کی جنگ آزادی اور حریت پسندوں کے عزم و حوصلے کا پتہ چلتا ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں قمر اعظم ”اردو ڈرامہ نگاری“ میں لکھتے ہیں:-

”اس میں انگریزوں کے خلاف عوام اور فوجیوں کی بغاوت اور شہزادہ مرزا مغل کی رہبری نے وطن پرستانہ سرفروشی اور سرفروشانہ وطن پرستی کے سلسلے میں قومی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ یہاں عقائد و عزائم، شدت و قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ان سے اثر انگیز مکالموں کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور منزل و مقصد کے راستے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان ڈرامائی واقعوں اور مکالموں میں ڈراما نگاری کی صرف معلومات ہی نہیں محسوسات بھی ہیں۔“

آزمائش کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔
مرزا مغل، "کیوں کیا ہوا؟"

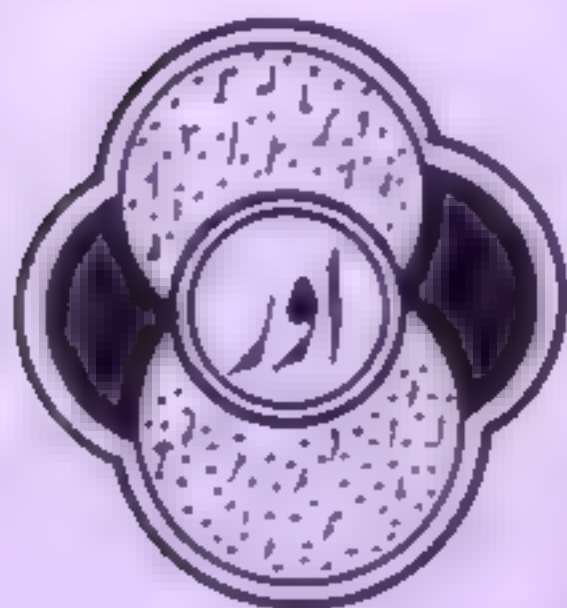
علیم الحسن اللہ خاں: "کیا بتاؤں زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ فرنگیوں کی گستاخیاں کیا کم تھیں آج اپنے ملک کی بیباکی دیکھ لی۔۔۔۔۔ میرٹھ کی فوج نے غدر کر دیا۔ وہاں مار دھاڑ کر کے باغی آج یہاں پہنچے۔ حضور اقدس سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے بادشاہ بن جائیں۔"

"آزمائش" کا پورا پس منظر سیاسی ہے جس میں انگریزوں کے معاندانہ رویے اور عوام کے استحصال کے واضح نقوش ابھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراموں میں سیاسی، سماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ یہ ڈرامے اس دور کے قومی اور سیاسی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ چند ڈرامہ نگاروں نے بڑی جرأت اور بیباکی کا ثبوت دیا اور ڈراموں میں واضح طور پر آزادی کا جذبہ اور مطالبہ پیش کیا۔



تحریک آزادی



اُردو وطن و مزاج

اُردو نثر میں طنز و مزاح کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔ اس سلسلے میں غالب کے خطوط خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ غالب کے خطوط ہی نے اُردو نثر میں طنز و مزاح کی خشتِ اول رکھی۔ خطوط غالب کے بعد ”اودھ پنچ“ کے طنز و مزاح نگاروں نے اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اودھ پنچ کے قلم کاروں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی اور مختلف اسالیب کے ذریعے اس فن کو ارتقائی منزلوں تک پہنچایا۔

اودھ پنچ سے قبل، مجویات، شہر آشوب اور نظموں کی صورت میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ اودھ پنچ کا اجراء ۱۸۵۷ء میں کھنؤ میں ہوا۔ اس اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ جنہوں نے طنز و مزاح کے لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار کیا تھا۔ اس کے قلم کاروں نے زندگی کے ہر شعبے اور ہر جہت مثلاً سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، اور تعلیمی مسائل اور معاملات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس دور کے حکمران طبقے اور انگریزوں کی عملداری کو ہدف طنز بنایا۔

”نقوش“ لاہور جنوری فروری ۱۸۵۹ء کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ:

”قدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی مرآۃ العروس شائع

ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۶۲ء میں ”اودھ پنچ“ جاری ہوا۔ اودھ

پنچ مشرق اور مغرب کے تضادم کا پہلا منظر ہے۔“

اودھ پنچ کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں :-

”اودھ پنچ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اودھ پنچ نے اپنی پالیسی کے ذریعے ملک و قوم کی خدمات ایسے وقت میں انجام دیں جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ آسمان سیاست پر بے پستی اور انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی وقت میں ملک کے عصری تقاضوں کو پورا کیا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا۔ اور ملک و قوم کی خدمت و تحفظ کے لئے متعدد سیاسی مضامین لکھے۔ منشی سجاد حسین بذاتِ خود کانگریسی ذہن رکھتے تھے اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کرتے رہتے تھے۔“

وزیر آغا ”اودھ پنچ“ کے عہد کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

”اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردِ عمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔ سیاسی، سماجی، اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا۔ انتہائی پستی اپنے جوہن پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر شخص اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ یکستون کی طرح بہتا چلا جائے گا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گزار کرے۔ جب اسے آئینے میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرہ و مضحکہ خیز حرکات کرتا نظر آیا تو فرد کو قدامت بھی محسوس ہوئی اور اس کے جوش و انہماک میں اعتدال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اودھ پنچ نے قوم کے طوفانی دریا

کو کناروں سے چھلکنے اور یوں تباہی و بربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی انتہائی کوشش کی اور اس دریا سے طنز و طرافت کی بے شمار چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر اس کی طغیانی میں دھیما پن پیدا کرنے کا قابل رشک کام سرانجام دیا۔

مذکورہ بالا اقتباس میں اودھ پنچ کے عمری سیاسی مسائل کا پورا تناظر بھاسے سلسلے آجاتا

ہے۔

وزیر آغا اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں :-

”اودھ پنچ کے ذریعہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کار میں منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا کے لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی حاجی بغلول، طرہ دار لونڈی، اور احمق الدین کے مصنف کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے جو خط ہندوستانی روسا کے نام لکھے وہ بھی انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اودھ پنچ میں ”لوکل“ اور ”موافقت زمانہ“ کے زیر عنوان ان کے جو مضامین چھپے تھے ان میں ملک کے سیاسی، موکی اور سماجی حارات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے۔“

سجاد حسین نے متعدد سیاسی اور سماجی مضامین سپرد قلم کئے نیز ان مضامین میں اپنے عہد کے سیاسی مسائل سے بھی بحث کی۔ سجاد حسین کے مضامین میں ”انڈیہ بچے والی چیل چلہاڑ معلوم و خواص میں از حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ کھلے خط سربستہ مضامین نیچر کا مارشل لار، مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں، جینجھٹ کا یہ مزہ ہے، کہ ہوں وہ بھی بے قرار، پروفیسر اودھ پنچ کے پولیٹیکل اقلیدس، بے مار کی توبہ، ٹیکس کی دم، ابر کامل اور سرکار انگلشیہ، منہ لگائے ڈومنی گائے تال بے تال، یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے، پولیٹیکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش، قانون اور اس کا دم ترمیم وغیرہ مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور آخر تک کانگریس کے علمبردار رہے۔ اس لئے انہوں

نے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جبکہ سیاسی رہنماؤں کے لئے لب کشائی بھی مشکل تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔ یہ مضامین طنز و مزاح کے پردے میں پیش کئے گئے تھے اس لئے قنون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور اسٹیمپ آر کا پہلو بھی برقرار رہا۔ ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز و مزاح کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ منشی سجاد حسین کا مضمون ”انڈے بچے والی چیل چلیاڑ“ اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جا رہے تھے۔ اور کانگریس کی مخالفت میں ”انٹی کانگریس“ کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ لہذا سجاد حسین ”انٹی کانگریس“ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے جیسے
کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی انٹی صاحبہ چٹا
کی بالکی نموجی منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں، اچی تو بہ کیجئے بویں ور
بچ کھیت بولیں“

سجاد حسین طنز و مزاح کے پیرائے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں، وہ اپنے خیالات کا اظہار بھرپور انداز میں کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین کے خطوط بھی سیاست کی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے بحیثیت مدیر ”اودھ پنچ“ مختلف اوقات میں مختلف افسرانِ بالا کو تحریر کئے تھے۔ خط کا ایک حصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے :-

”صاحب من ! جب کسی قسم کی کاروائی کا محکم ارادہ کر لیا جائے اور کچھ
محافظ نہ رہے کہ ملک کے مناسب حال ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ موقع
افہام و تفہیم، گنجائش، پند و وعظ اس طرح غائب ہے جیسے برہما یا
ہندوستان گردنیا کا کوئی حل بے نتیجہ رہ نہیں سکتا۔ آج نہیں کل یہاں
نہیں وہاں، ضرور بالضرور، کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتا ہے ممکن کیا یقین
ہے کہ تمہارے آدو نالے کی طرف سے کانوں میں انگلیاں بڑے زور سے

ٹھونس لیں، حالت خستہ کی طرف سے آنکھ پھیر لی۔

منشی سجاد حسین اپنے خطوط میں طنز کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں جو یقیناً طنز سے خالی نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو خطوط انگریز افسروں کو لکھے ہیں، ان میں بھی تیر و نشتر سے کام لیکر اپنی بات کہی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”لارڈ رنڈالف چرچل جو بد قسمتی ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں، بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کمسنی اور درشت گوئی اور بدزبانی مانع ترقی ہے۔ معاملات ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی یہ سمجھ لو کہ آزادی اور شوریہ کی قوم کی دست برد سے اسٹراز قیصری سے محفوظ رکھنے کا مستند و قچہ ہندوستان ہی ہے۔“

منشی سجاد حسین کے اس طرح کے متعدد خطوط ملتے ہیں جن میں طنز و مزاح کے پیرایہ بیان میں حکام بالا کو خواب غفلت سے بیدار کیا ہے یا پھر ان کے دانستہ طور پر اپنائے گئے بے حیا رویے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد برق ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح اور تحریف کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جوالا پرشاد برق کو اردو ادب کا مورس اور چاسر کہا ہے۔ پنڈت جوالا پرشاد برق کے بیشتر تراجم ملتے ہیں۔ انہوں نے چند ایسے مضامین بھی لکھے جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث مل جاتی ہے۔ ان کا ایک مضمون ”البرٹ بل“ بطور خاص قابل توجہ ہے۔ اس مضمون کا ایک نکاحیہ نمونہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

”..... اختیار ملے مگر برائے نام مگر جہت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندو۔ دشمنوں سے سبق لو، کچھ کھو چکے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے۔ جس کی لائٹیں اُس کی بھینس۔ اگر تم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فقہ انگیزی پر کسر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا مگر شر بہارا شیوہ نہیں ہم

تو سچے خیر خواہ سرکار میں۔ مگر بائے سے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں
 ڈوب گئی، کیا کیا خیالی قلعے بنائے گئے مگر کنسکا ڈٹ کے ایک ہی گولے نے
 ان کا صفایا کر دیا۔

ملن و مزاح نگاروں میں نواب سید محمود آزاد کا نام بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے
 تلخ تجربات کو شوخی و ظرافت کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں معنوی
 تہذیب اور ثقافت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے تحریفات کے انداز میں ایک ”ڈکشنری“ بھی
 تحریر کی تھی جس میں انہوں نے ظریفانہ پیرائے میں بعض تعلیمات کے معنی بتائے ہیں۔ چند اقتباس
 ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں۔

”پولسی (حکمت علی)۔۔۔ مہران پارلیمنٹ کے آپس کا تازہ و نیاز کمزور کو دبا، بڑے
 سے ڈرنا۔۔۔ مار کے آگے بھاگتے کے پیچھے جانا، کسی کے جتنے ہوئے گھر سے
 تاپنا، پارٹی فیلنگ (پاسداری جماعت) مرثیے بنگام کی طرح چیلنا،
 غول بیا بانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم قسموں کو راہ راست سے بہکانا، بے
 ہودہ شکایت، ناجائز تہمت، وزارت کے کھونے کا مدد، جبرگدان،
 کوئی سُننے نہ سُننے اپنی کہے جانا۔۔۔

”پارلیمنٹ (جلسہ مہران علی) مدبروں کا آشیانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت
 گویائی کا تماشہ دکھانے کا تھیٹر، باہمی نفقہ، ور ذاتی رشک و حسد کا تنور،
 انصاف آموزی کا وہ اسکول جہاں روسیوں کے غلم ناحق کے انسداد کی
 کوئی عمدہ سبیل نہیں۔“

”یورپین کنسرٹ (یورپ کے سلاطین کا اتفاق، تمدن کی آرسٹ فوج، دنیا کی آزادی کا
 ضامن، مشرقی مسئلوں کے حل کرنے کی کمرل، کمزور کو زور و زور اور زور آور کو کمزور
 بنانے والی دلائی کل، کمزور سلطنتوں کے لئے ہوا سے کا نیا قانون۔۔۔۔۔“
 سید محمود آزاد کے مضامین میں ”روندا، اجلاس جنجال کونسل، اور گرم ما گرم تار کی خبریں
 ہندوستان کے سیاسی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔

اس دور کے اخبارات میں "الپنج" بھی قابل ذکر ہے۔ یہ اخبار پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔ اس اخبار نے اس دور کے عصری سیاسی اور سماجی مسائل اور ہنگاموں سے بحث کی ہے۔ "الپنج" میں "سوال از آسمان و جواب از میان" کے عنوان کے تحت انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کا احساس اور ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جبار ہیں:

سوال: ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں۔ اور انگریز دن میں کتنی دفعہ

اور کون کون وقت کھاتے ہیں؟

جواب: امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بیماروں کو میسر ہی نہیں۔ اور غریب بچارے کبھی دو دن اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں۔ انگریز دن میں پانچ مرتبہ

سوال: انگریزی کھانوں میں پڈنگ بنانے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: پڈنگ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان سے گھوٹے روپے من کے حساب سے خرید کر انگلینڈ چلائے جاتے ہیں وہاں اس کا ماندہ بنتا ہے اور وہاں سے روپے سیر کے حساب سے یہاں روانہ کیا جاتا ہے۔ اس ماندہ میں گھی، دودھ اور چینی ملا آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔ جب تیار ہو جاتا ہے تو اس میں سور کی چربی بجائے گلاب اور کیوڑے کے ڈالتے ہیں۔

ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے۔

سوال: خون کے مجرم کو قانون کی کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی؟

جواب: ہندوستانی کو سزا دینے کے لئے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں جب چاہے قید کیجئے، اور جب چاہے پھانسی دیجئے۔ مگر کوئی انگلش نژاد وفادار رعیت دس ہندوستانی بھی مار ڈالے تو کچھ پروا نہیں۔

سوال: سزائے جیس دوام بعیور (کذا) دریاے شور کن مجرموں کے لئے مقرر کی گئی ہے؟

جواب : پہلے تو یہ مناصف دو تین مجرموں کے لئے تھی مگر دوجرم میں اور بڑھ گئے ہیں۔ ایک تو کسی انگریز سے مقابلے کے ساتھ باتیں کرتی دوسرے گورنمنٹ کی کسی بات پر نکتہ چینی کرتی ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں چند اقتباسات اپنیج " کے تحریر کئے گئے جو انگریزوں حاکموں کے سفاکانہ رویے کے خلاف تھے۔

ادھر پنج کے بعد طنز و مزاح کا عبوری دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں مہدی، قادری، محفوظ علی بدایونی، نیاز فتحپوری، سجاد یلدرم، سلطان حیدر جوش، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی، وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

معین عقیل عبوری دور کے قلم کاروں کے سیاسی رجحانات اور اصابت فکر کا جائزہ لیتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں۔

"محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد انصاری ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ملا رموزی، ایسے صاحب قلم میں جنہوں نے اپنی نظریات و تحریروں کے ذریعے مغربی تہذیب، مغربی افکار، مغربی سیاسیات اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کی سیاسی بلبل اور مسائل کی عکاسی ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی تحریروں کا مقصد محض اپنی قوم کے کردار کی اصلاح تک ہی محدود رکھا ہے۔"

مسیر محفوظ علی نے سیاسی مباحث پر متعدد مضامین لکھے ان کے مضامین میں "انجمن تجاہل عامیہ کا غیر معمولی جلسہ"، "کاروائی جلسہ"، حاجی صاحب کی تقریر اور کاروائی جلسہ"، "حاجی صاحب کی تقریر جنگ پر"، "بلبلان اسیر کی رہائی"، "مسٹر صاحب دین" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ میر محفوظ علی علی برادران کی جیل سے رہائی پر اپنے ایک مضمون "بلبلان اسیر کی رہائی" میں لکھتے ہیں۔

بچہ اباجان یہ کیا کام کرتے ہیں ؟

باپ اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔

بچے: تو کیا جسے ضرورت ہو سودا سلف لادیتے ہیں ؟
 باپ: ہماری محبت تو انہیں ایسی ہے کہ اس کے لئے بھی تیار ہیں لیکن
 اصل میں یہ اور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں۔
 بچے: تو کیا یہ بوجھ اٹھاتے ہیں ؟
 باپ: (آنکھوں میں آنسو آگئے) حقیقت میں یہ بڑے بھاری بوجھ
 اٹھاتے ہیں۔

طنز و مزاح کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک
 صاحبِ طرز ادیب، سیاست دان، اعلیٰ پائے کے صحافی اور طنز و مزاح نگار تھے۔ طنز و مزاح
 کے ضمن میں ”الہلال“ کا شذرہ ”افکار و حوادث“ قابل ذکر ہے اس میں مولانا کی طنزیہ و مزاحیہ
 تحریریں ہوتی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں انگریزوں کو ہدف طنز بنایا گیا ہے۔
 مولانا محمد علی جوہر کا نام ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل
 ہے۔ وہ محب وطن تھے۔ انہوں نے لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں انگریزوں سے کہا تھا
 ”میں یہاں سے آزادی کا وثیقہ لیکر جاؤں گا یا پھر یہیں پر اپنی جان دے دوں گا۔“ بالآخر مولانا محمد
 علی جوہر کی وفات لندن میں ہوئی اور انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔
 مولانا محمد علی جوہر نے اسی مقصد کے تحت اخبار ”ہمدرد“ جاری کیا۔ یہ ایک اہم سیاسی اخبار
 تھا۔ ”ہمدرد“ میں انہوں نے متعدد سیاسی مضامین لکھے اور ایسے وقت میں قلم اٹھایا جب ملک
 میں بہت سے سیاسی مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ سیاسی طور پر ہندوستان کے حالات منتشر تھے مولانا
 محمد علی جوہر نے اپنے قلم اور خیالات کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔ ان کا ایک مضمون
 ”سائمن کمیشن اور ہندوستان“ کے عنوان سے ”ہمدرد“ کے ۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں
 شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں لکھتے ہیں:-

”حسرت صاحب (مولانا حسرت موہانی) چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاک
 خانہ بنایا جائے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے بنائے ہوئے
 دستور اسامی کے تیار ہونے تک جسے حسرت صاحب اس کمیشن کے منہ

پر پھینکنے کے لئے جم سے کہتے ہیں جم ایک پوسٹ کارڈ ڈاک خانے میں ڈال دیں، جس میں لکھا ہو کہ جم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے، یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ فروری کی ہڑتال ہوگی۔

اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان میں کمیشن کی آمد کی کھل کر مخالفت کی تھی نیز حکومت پر طنز بھی کئے تھے۔ رقمطراز میں :-

”اگر کمیشن کا ہر رکن ہندوستانی ہوتا تب بھی ہمیں کمیشن پر گز قبول نہ ہوتا اس لئے کہ اگرچہ خوش دامن صاحبہ تشریف نہ رکھتیں تاہم آخر فیصلہ میاں بیوی کے ہاتھ میں نہ ہوتا بلکہ ہندو مسلمان دونوں بیویاں بن جاتے دیو کنوں اور بیرونوں کی طرح بڑتے، اور فیصلہ میاں کرتے اگر جم دونوں اتحاد و اتفاق بھی کر لیتے تب بھی جب تک فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ ہوتا، وہی عربوں کی مثل صادق آتی ہے کہ ”ہم کام میں گھروالی سے مشورہ ضرور کریا کرو مگر کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو“۔

اس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں ملازمی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ملازمی کی شہر بڑی متنوع ہے۔ انہوں نے سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ ان کے طنز و مزاح کا بیشتر حصہ سیاست پر مشتمل ہے۔ ان کے مضامین میں سیاسی واقعات اور سانحات کی طرف اشارے جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

”اے انگریزی تیل سر میں ڈالنے والی خبر داری در آگاہی ہے واسطے تمہارے ان ایڈیٹروں خبر اردو کے کہ یہیں جو ب دیتے وہ مسنگ ایک برس تک نامہ نگاروں اور خریداروں، اپنے کو ساتھ بہار مہر و فیتورے اپنی سکے، اور لاٹھ خارج وفد مسٹر محمد علی کوست تھ تعصب اور گھمنڈ قوت حکومت اپنی کے اگرچہ دم تیج ناک کے گردیا جماعت سن فیل نے

فوجوں برطانیہ کا وغیرہ وغیرہ^۱

طنز و مزاح کا عبوری دور ختم ہو جانے کے بعد جدید طنز و مزاح کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اگلے دور میں رجحانات میں تبدیلیاں آئیں اور سیاسی صورت حال نے بھی نیا موڑ لیا۔ اس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں فرحت الشریک، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، عبد المجید سالک، چراغ حسن حسرت، امتیاز علی تاج، میاں عبدالعزیز فک، پیما، کنہیا مال کپور، احمد شاہ بخاری بطرس، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، شوکت تھانوی، حاجی قلی قلی، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔

ان مزاح نگاروں میں صرف انہیں کو زیر بحث لائے ہیں جن کے یہاں سیاسی اعتبار سے طنز و مزاح کے پہلو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں عظمت اللہ خاں کی تحریروں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ عظمت اللہ خاں ایک سنجیدہ طنز و مزاح نگار ہیں۔ وہ بڑی عمدگی اور شگفتگی سے اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے مضامین بڑے دلچسپ اور سنجیدہ ہوتے ہیں جو قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کے مطالعہ میں ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرح کے مضامین میں ”گڑیا خانہ“، ”ڈیڑھ اینٹ“ خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان مضامین میں اس دور کے سیاسی مسائل پر خاطر خواہ بحث مل جاتی ہے۔ مضمون ”ڈیڑھ اینٹ“ میں لکھتے ہیں۔

”غرض ہندوستانی افواج کا احسان کہ برطانیہ کو ہندوستان پر مسلط کر دیا،

امن کا دور دورہ ہوا۔ لارڈ میکالے کا کرم کہ ایک طرف تعزیرات ہند

مرتب کیا اور دوسری طرف علم مغرب کی گنگا بہائی“۔

اس مضمون کا ایک اور اقتباس جس میں سنجیدگی کے ساتھ طنز کا پہلو ملتا ہے، ذیل میں پیش

کیا جا رہا ہے :-

”مشہور ہے کہ کسی انگریز سے پوچھا گیا کہ آپ کو ہندوستان کا کونسا میوہ

بھایا؟ تو اس ستم ظریف نے ساری ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی تحقیقات

بھردی۔ اس نے ہنس کر صرف یہ کہا: پھوٹ نہ تھ

^۱ لے بحوالہ ذریعہ ”ادب میں طنز و مزاح“ صفحہ ۱۸۷۔ لکھنؤ: امین احمد، اردو ادب میں طنز و مزاح، ”مستقر“ از

معوش، ہر طنز و مزاح نمبر میں ۱۶۶۔ لکھنؤ: امین احمد، طنز و مزاح، معوش، دسمبر میں ۱۸۔

مضمون "گڑیا خانہ" میں لکھتے ہیں :-

"اب وہی ہندوستان ہے جہاں مادرِ وطن، در سوراخ کی خاطر مہاتما اور مولانا جیل جانا فخر سمجھتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے ؟ برطانوی شہنشاہیت اور دفتر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے۔"

میاں عبدالعزیز فلک پیما کا نام طنز و مزاح کی تاریخ میں بڑی، ہمیت رکھتا ہے۔ ان کی نثر شگفتہ، لہجہ دل نشین متین اور سنجیدہ ہے۔ فلک پیما کے مضامین میں عصری سیاسی مسائل اور عوام کی جدوجہد آزادی سے بحث ملتی ہے، ان کے اس قسم کے مضامین میں "شیلے کی سڑکیں"، "عدالتیں"، اور شیطان اور بزرگ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مضمون "شیلے کی سڑکیں" میں لکھتے ہیں :-
 "شیلے کی سڑکیں لاکھ سر پنھیں، حکومت کی مغرور درکش کے لئے اٹھ نہیں آئیں
 کروٹینگے پاؤں موجود ہیں۔"

فلک پیما مختلف کرداروں کی زبان سے اپنی بات بڑی عمدگی کے ساتھ طنز کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مضمون "عدالتیں" میں لکھتے ہیں :-
 "پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں ان کے دروازوں پر درمیں بیٹے سے چار
 بیٹے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصل ذیل قسم کی درمیں
 آتی رہتی ہیں۔"

چلو بکڑی چند اور قرض محمد

چلو کروڑی مل اور قاتے قال

چلو لالہ گروہی مل اور مرہون ابھی

یہ چل چلو غدر کے بعد شروع ہوا تھا اور شاید قیامت تک رہے۔

علامہ کلیم الدین احمد "آرڈو ادب میں طنز و مزاح" غیر نقوش لاہور ص ۲۲۵۔ علامہ عبدالعزیز فلک پیما نے
 فلک پیما ص ۱۲۹۔ علامہ عبدالعزیز فلک پیما نے مضامین فلک پیما ص ۱۰۹۔

مضمون "شیطان اور بزرگ" میں لکھتے ہیں :-

"جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے اسے موٹر میں سیر کر لئے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کا انگریسی یا مہاسبھانی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے، شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوئی ہے۔"

فلک پیمائے ایک مضمون میں "فرانس اور ہندوستان" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-
 "کوئی ہزار سال سے ہندوستان کا منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انہیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور یہ چال کھلی جائے کہ ساری دنیا میں کوئی اس ذلت سے نہ بچ سکے آج کل انگریز بیچا سے تختہ مشق میں اصل منشا یہی ہے کہ جب باری بار "سب قومیں ہندوستان پر حکومت کر کے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان ایک دم ساری دنیا پر حاوی ہو کر شہنشاہی کرنے لگے۔"

اقتباس بالاسے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ فلک پیمائے اپنے مضامین میں انگریزوں کا تسخیر اڑایا ہے اور ان کی بد اعمالیوں کو وطنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اُردو وطنز و مزاح میں چراغ حسن حسرت موبانی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حسرت جنگ آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ انہوں نے بیشتر نکابہر کا لم لکھے۔ اس دور کی سیاسی صورت حال، ہنگامی واقعات اور دیگر مسائل سے بحث کی ہے۔ پنجاب کی چند سیاسی شخصیتوں کو وطنز کا نشانہ بنایا۔ اور چند انگریز پرست سیاست دانوں کا تسخیر اڑایا ہے۔ اپنی کتاب پنجاب کا جغرافیہ میں لکھتے ہیں :-

کانگریسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگریس ندی بہت مشہور

ہے جو ست پڑا سے ایک زمانے میں بہ نکلے تھی یہ گدے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا بھی پانی آتا تھا۔ بہر حال یہ برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

دریائے کالی

ہندو بہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے 'کالی ناگ' کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا ہے اور ہندو بہا سبھا کی ترانی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہا لےاتا ہے... کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندو بہا سبھا کی ترانی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جیتاتے ہیں مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دریا کس علاقے کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دُھن بریسی ہے اس کا طاس جسے ٹریبیول کہتے ہیں بہت زرخیز ہے۔

جہاں تک شوکت تھانوی کی مزاح کا تعلق ہے وہ بڑے زود نویس قسم کے مزاح نگار تھے۔ سودشی ریل" اور "لکھنؤ کانگریسی سیشن" ان دونوں تحریروں میں انہوں نے اس دور کی سیاسی تحریکوں کو جاگڑ کیا ہے۔ سودشی ریل میں لکھتے ہیں:-

"دیکھتے ہیں کیا کہ ایک بڑا جھوس جھنڈوں، جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا ہندو ماترم کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا بھائی یہ کیا ہے؟
جواب ملا کہ کیا سو رہے تھے؟
خیر نہیں کہ سورا ج مل گیا ہے؟....."

اور ایک آزاد اور خود مختار سائنس بیکر ہونے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا ہے۔

”لکھنؤ کانگریس سیشن“ کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

”ایجنڈے میں اب آزادی کامل کی تجویز تھی امید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ یہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہو گئی مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کونسی جماعت لائے۔

نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں۔

شہزادگان نے کہا۔ ”نہیں پہلے آپ“

نواب زادگان نے کہا۔ ”پہلے آپ“

شہزادوں نے کہا۔ ”واللہ یہ نہ ہوگا۔

پہلے آپ، آخر اس پہلے آپ اور نہیں۔

حضرت اس پہلے آپ ہی میں مچ ہو گئی اور اجلاس ختم ہو گیا۔“

کنہیا لال کپور نے معاشرے میں پھیلے ہوئے سیاسی انتشار، بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ سیاسی عمائدین اور زعماء کی شخصی کمزوریوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں :-

”آپ نے سیاست کی باقاعدہ تعلیم کہاں حاصل کی؟ اپنے آپ کو مہاتما

گاندھی، مسٹر چرچل اور جوزف اسٹالین سے کیوں افضل سمجھتے ہیں؟

آپ جل خانے سے کیوں ڈرتے ہیں؟

ایک اور جگہ گاندھی جی کی قربانیوں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں :-

”کمال کر دکھایا مہاتما جی نے !

پورے تین ہفتہ کچھ نہیں کھایا

روحانی طاقت ہے۔

اوتار میں۔“

میں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ ہاں تاجی کبھی مر نہیں سکتے ۔
ایک دفعہ تو دنیا کو ہلا دیا

میں کہتا ہوں یہ ہے اصل شجاعت

یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے
تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے ۔

تمہارا کیا خیال ہے تمام بزدلوں کو گوئی مار دی جائے

ہاں

تو پھر ہندوستان میں رہ ہی کون جائے گا ۔

رشید احمد صدیقی کا نام اردو دنیا میں بحیثیت طنز و مزاح نگار بڑی امتیازی حیثیت رکھتا
ہے ۔ ان کے یہاں طنز و ظرافت کے پس پشت چند اصلاحی مقاصد بھی نظر آتے ہیں تو تہذیبی ،
سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑے اہم اور ضروری تصور کئے جاتے ہیں ۔ رشید احمد صدیقی
غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے ۔ ذکاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ وہ معمولی بات کو اپنی
تحریروں کا موضوع بنا کر طنز کا پہلو مقصدیت کے تحت پیدا کر لیتے ہیں ۔ ان تحریروں کے چند نمونے
ملاحظہ کیجئے ۔

”عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں
اور نہ میونسپلٹی سے ۔ انگریز تو ممکن ہے اس لکڑے ڈرتے ہوں کہ تعزیرات
ہند اور میونسپلٹی دونوں ان کی آوردہ ہیں ۔ عشاق یوں نہیں ڈرتے
کہ رزق اور موت دونوں سے بے نیاز ہیں ۔“

”انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا ۔ عشاق کو شعراء نے ۔ بعض
لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعراء اور آئی سی ایس کے اثر
سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ سوراج مل جائے ۔ انگریزوں
میں عشاق اور عشاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔“

ہر ہندوستانی کے دو پیدائشی حق ہیں ۔ ایک بلوغ اور دوسرا سوراج ؟

نہان کو آپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک کیفیت دماغی ہے اور ممکن ہے
یہی سب ہو کہ کو آپریشن اور مغالطہ اب تک کسی منطقی یا نفسیاتی تعریف
کے متحمل نہ ہو سکے۔

اُردو نثر میں طنز و مزاح، تحریف اور فکامیہ مضامین کا جو سلسلہ غالب کے خطوط سے شروع
ہوا تھا "اودھ پنچ" کے بکھنے والوں نے اسے باضابطہ فن کی حیثیت دی۔ اخبار "الپنچ" نے
اس کے ارتقار میں اہم کردار ادا کیا۔ کنہیا لال کپور اور رشید احمد صدیقی جیسے صاحب قلم
فکاروں نے اسے نقطہ عروج تک پہنچایا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اُردو طنز و مزاح نگاروں نے
اپنی گرانقدر تحریروں کے ذریعہ عوام کو غلامی کا احساس دلایا اور آزادی ہند کی تحریکوں کے فروغ
میں بھرپور حصہ لیا۔



تحریک آزادی



اردو خود نوشت و سوانح

ایک فرد اپنی زندگی کا طویل سفر کرنے کے بعد جب عمر طبعی کو پہنچتا ہے تو اسے اپنی گزشتہ زندگی کے حالات و کوائف، جن سے وہ دوچار ہے، ضبطِ تحریر میں لانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح گزشتہ زندگی کے طویل عرصہ پر محیط جب فرد اپنی زندگی کے مکمل طور پر قلم بند کر لیتا ہے تو اس تحریر کو ہم خود نوشت سوانح عمری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

خود نوشت سوانح عمریاں مختلف پہلوؤں اور مختلف جہتوں سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی وغیرہ۔ خود نوشت میں چونکہ فرد اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدات و تجربات اور رجحانات و میلانات اور ماحول وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اس لئے وہ دراصل تاریخ ہوتی ہے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور پورے معاشرے کی۔ خود نوشت زیادہ اہم ہوتی ہے بہ نسبت سوانح عمری کے۔ کیونکہ خود نوشت کو فرد خود قلم بند کرتا ہے، جبکہ سوانح عمری میں ایسا نہیں ہوتا۔

اگر دوا دہ میں سیاسی، سماجی خود نوشت سوانح عمری کے نمونے انیسویں صدی کے رجب آخر میں مل جاتے ہیں۔ سیاسی خود نوشت سے مراد ان خود نوشت سوانح عمریوں سے ہے جنہیں یا تو کسی سیاسی یا سماجی شخصیت نے قلم بند کیا ہو یا ان میں سیاسی و سماجی مسائل زیر بحث آئے ہوں۔ سیاسی خود نوشت سوانح نگار اپنے مقصد سے شدید ذہنی و جذباتی لگاؤ رکھتا ہے اور ہر چند اپنے زاویہٴ نگاہ سے دیکھتا ہے نیز اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس لئے یہ ذہنی و جذباتی

وابستگی اور تبلیغ اس کو جانبداری میں مبتلا کر دیتی ہے جس کے سبب وہ ہر واقعہ کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے مصنف کے حالات زندگی تو صرف ایک زیب داستان کے طور پر بیان ہوتے ہیں۔ اصل میں اس کی خود نوشت کا نقطہ نگاہ کوئی تحریک یا سیاسی نظریات ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ عوام تک پہنچا سکتا ہے۔ سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح عمریوں میں تاریخی عنصر کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ خود نوشت کا مصنف براہ راست یا بد واسطہ طور پر کسی تحریک یا کسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے بیانات سیاسی ہوتے ہوئے بھی کافی واقع ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح عمریوں میں ایک ہی تحریک یا واقعہ مختلف اور متضاد شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ مختلف اشخاص سے ایک ہی واقعہ کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں یا واقعات کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کرنے میں اپنی توجہ صرف کر دیتے ہیں۔ اس طرح سیاسی یا سماجی خود نوشتیں تاریخی عنصر کی فراوانی کے باوجود تاریخ کا نعم البدل نہیں ہیں۔ البتہ تاریخ کے لئے مواد ضرور فراہم کرتی ہیں۔ سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح عمریاں بیشتر خارجی واقعات اور حادثات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں جذبات کی عکاسی بہت کم ہوتی ہے یہی وہ عنصر ہے جس کی بدولت سیاسی و سماجی خود نوشت کا کینوس بیشتر سیاسی تحریکات، اشخاص و افکار پر مبنی ہوتا ہے۔

اس باب میں شامل خود نوشت سوانح عمریوں کے نام اس طرح ہیں۔ "تواریخ عجیب موسوم بہ کالا پانی" از جعفر تھانیسری۔ "داستان غدر" از ظہیر دہلوی۔ "اعمال نامہ از رضا علی میرا" افسانہ از چودھری افضل حق۔ "یاد ایام" از ذوال احمد سعید خاں چغتاری، "سرگزشت" از عبدالحمید سالک بٹاوی، "لطیف کی کہانی" از عبدالصغیر بٹاوی۔ "تلاش حق" از مہاتما گاندھی مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین۔ "اپنی کہانی" از ڈاکٹر راجندر پرشاد مترجم گوپی ناتھ امن۔ "نقش حیات" از مولانا حسین احمد مدنی۔ "میری کہانی" از جواہر لال نہرو۔

مذکورہ بالا خود نوشت سوانح عمریوں کو سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے جعفر تھانیسری نے اپنے ایام امیری کے زمانے میں "تواریخ عجیب موسوم بہ کالا پانی" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس خود نوشت میں انہوں نے وہابی تحریک کا تذکرہ کیا ہے اور اس تحریک

کے سرگرم کارکنوں کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے نیز انگریزوں کے مظالم کی روداد بھی بیان کی ہے۔ اس میں آزادی کی جدوجہد اور احیائے دین یک وقت دونوں سے بحث مل جاتی ہے۔ جعفر تھانیسری "تواریخ عجیب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"جہاں تک مجھے علم ہے اس مقدمہ (انبالہ) میں ہم لوگوں کی گرفتاری بھی منشاءِ ایزدی اور اس آیت کی فقط پیچ اور جھوٹ کی پرکھ اور آزمائش کے واسطے تھی ورنہ وعدہ حق موجود ہے "وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا" پس اگر یہ سبب آزمائش کا نہ ہوتا تو کبھی بھی سرکار انگریزی کے ہاتھوں ہمیں صدمہ نہ پہنچتا۔۔۔

پس یہ کتاب گویا آیت مذکورہ بالا کی تفسیر سمجھنی چاہیے۔

جعفر تھانیسری نے اس خودنوشت میں اپنے انبالہ کے مقدمہ اور قید فرنگ کے میں سال کے حالات و کوائف کو قلم بند کیا ہے۔ نیز اپنی زندگی کے مذہبی اور سیاسی حالات کو بھی مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اور خصوصاً دہلیوں کی تحریک کی مقبولیت و محنت کش اور زبوں حال عوام کی داستان تحریر کی گئی ہے۔

ایک اہم خودنوشت سوانح عمری "داستانِ غدر" ہے۔ اس کو اردو کی اولین خودنوشت تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف ظہیر دہلوی تھے۔ ظہیر دہلوی کی وابستگی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے رہی۔ اسی لئے یہ کتاب اس دور کی سیاسی کشمکش، امراء و سلاطین کی سراسیمکی کی آنکھوں دیکھی تصویر پیش کرتی ہے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنے زندگی کے حالات، تہذیبی اور ثقافتی منظر میں بیان کئے ہیں۔ اس خودنوشت میں انقلاب ۱۸۵۷ء زیادہ نمایاں ہے اور ان کی زندگی کے حالات پس پشت نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ میرامن نے عبدالحق تک میں "رقمطراز ہیں:-

"داستانِ وقائعِ غدر میں آپ نے کاحسنہ حقیقت نگاری کے لحاظ سے جیسا کچھ

بھی ہو اس میں مجلسی روابط اور سماجی احوال کی بڑی معلومات افزا در

سبق آموز داستان ملتی ہے خصوصاً دہلی اور قلعہ معلیٰ کی معاشرت کے دلچسپ
نقشے نظر سے گزرتے ہیں۔

غدر شاہ میں جو حالات و قوع پذیر ہوئے ظہیر دہلوی نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا
اور کنبہ ان واقعات کا حال بڑی درد مندی و درد سوزی کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔ اس قیامت
صغریٰ سے ان کے غامدن کے افراد بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کے خسر اور چچ انگریزوں کے منہام کا شکار
ہوئے اور انہیں بھی مجبور وطن کی سرحدی گئی۔ وہ در بدری درخت بدلتی کی داستان قلعہ معلیٰ کی بھی رونق
سے متروغ کر کے انگریزوں کے منہام اور یورپیوں کے منہام پر ختم کر دیتے ہیں۔ ظہیر دہلوی نے انگریزوں
کے منہام کی بولناک داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مورخ بخش باقی کو ساڈیر سس کے
سامنے پیش کیا گیا تو اسے یہ باتھی بھی باغی نظر آیا۔ باتھی کا باغی موناں بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ
ہر آزادی پسند اور حریت پسند انسان، انگریزوں کو باغی نظر آتا تھا بلکہ غلامی کے اثرات جانوروں
بھی قبول کئے تھے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب میں بہادر شاہ ظفر کو اس انقلاب سے بے تعلق ظاہر کرتے ہوئے
دکھایا ہے۔ جب بادشاہ کے پاس میرٹھ کے باغی فوجی کمک کے لئے پہنچے تو انہوں نے کہا۔

”سنو بھائی : مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں فقیر محراب ایک تکیہ ہائے مجھے
اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ سلطنت
تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے۔۔۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں
میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں گا۔ فوج نہیں کہ تمہاری مدد کروں گا۔
یک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان
ہو کر انگریزوں سے صلح صفائی کرا سکتا ہوں۔“

برجسٹل ”داستان غدر“ کی قدر و قیمت اور تاریخی اہمیت سے اردو کا کوئی بھی ذی شعور ادیب
انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اردو کی ابتدائی خود نوشتوں میں سے ہے جو اپنے اسلوب بیان اور تاریخی
و سیاسی واقعات کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

۱۔ سید عبداللہ ”میرامن سے عبد الحق تک“ سنہ ۱۳۵۷ء ص ۴۳۔

۲۔ ظہیر دہلوی ”داستان غدر“ ص ۲۴۔

اس سلسلے کی ایک اور اہم خودنوشت "اعمال نامہ" ہے۔ اس خودنوشت کو سر رضا علی نے تصنیف کیا تھا جس کو اردو کی ایک مکمل اور مستند خودنوشت کہا جاسکتا ہے۔ "اعمال نامہ" کا مطالعہ کرنے کے بعد اس عہد کی سیاسی تنظیموں اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ "اعمال نامہ" میں پیش کردہ سیاسی حالات اور ادبی مباحث پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو سیاست سے جس قدر لگاؤ تھا اسی قدر وہ ادب کا بھی ولدادہ تھا۔ سیاسی بصیرت اور ادبی ذوق کا حسن امتزاج "اعمال نامہ" کو دوسری خودنوشتوں سے ممتاز اور ممتاز بنا دیتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی ایک اہم جماعت "محمدن ایجوکیشنل کانفرنس" تھی۔ اس کانفرنس میں سر رضا علی نے سیاسی سطح پر بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اس کانفرنس کا ایک اجلاس بنگال میں ہونا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہار اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے یہ احساس ہوا کہ اس کے پس پردہ کہیں حکومت اور لیٹننٹ گورنر کا ہاتھ تو نہیں ہے اور اس انجمن کے ذریعے مسلمانوں کو تعزیر گراہی میں تو نہیں ڈالنا چاہتے۔ لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ لیگ قائم کرنے سے بانیان لیگ کی غرض گورنمنٹ کو امداد دینا یا کانفرنس کی مخالفت کرنا نہیں تھی بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی جن کو یک طرفہ گورنمنٹ اور دوسری طرف کانگریس پامال کر رہی تھی کماحقہ مخالفت کی جائے۔" ۱

سر رضا علی نے ۱۹۱۱ء کی ہندو مسلم کانفرنس کا تذکرہ کیا ہے جس میں اردو ہندی انتخاب کے مسائل زیر غور آئے تھے۔ اس کتاب میں محلی شہر کانپور کا مسئلہ اور اس کے سیاسی نیز مذہبی پہلوؤں پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے سفاکانہ مظالم کا بیان مفصل طور پر کیا گیا ہے۔ سر رضا علی کی خودنوشت گزشتہ پچاس سالہ ہندوستانی معاشرت اور سیاست پر محیط ہے۔

"میرا افسانہ" چودھری افضل حق کی تصنیف کردہ خودنوشت ہے۔ اس کا زیادہ حقہ سیاسی ہے

لیکن اس میں کہیں کہیں مذہبی رنگ بھی ملتا ہے۔ مصنف کی پوری توجہ ملک کے سیاسی اور قومی کردار پر مرکوز نظر آتی ہے۔

یسویں صدی کی دوسری دہائی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بہت ہنگامہ خیز تصور کی جاتی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں چودھری افضل حق کا تقریباً سب انسپکٹر پولیس کی حیثیت سے لہیا میں ہوا تو انہیں ہنگامہ خیز حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے اس دور کے مختلف عمارت کو اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔ پولیس افسران کے ناروا مظالم اور معاندانہ رویوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک پولیس انسپکٹر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”غلام ہندوستان میں سب انسپکٹر پولیس کا بھوکا بیٹھا ہے۔ جدھر نہ اٹھایا لوگوں کو چیرتا پھاڑتا چلا جاتا ہے۔ سرکار کے درمیں کے ہاتھوں انسانیت کی ایسی تذلیل شاید ہی کہیں ہوتی ہو۔“

ان کی خود نوشت کا یہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور محرمیوں کے ظلم و استبداد کا پتہ چلتا ہے۔ چودھری افضل حق محب وطن تھے۔ ان کے دل میں محبت کا جذبہ کار فرما تھا۔ ملک و قوم کی خدمت کی غرض سے انہوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دیدیا اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنا شروع کر دی۔ گاؤں گاؤں جا کر تقریریں کیں۔ عوام کو غلامی سے نجات دلانے اور انگریز غلامی کے خلاف اکسانے میں اہم رول ادا کیا۔ نتیجہ کے طور پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ طرح طرح سے ایذا پہنچائی گئی جس کا بیان مندرجہ ذیل الفاظ میں اس طرح کیا گیا ہے:-

”غرض بابر کا ہندوستان دلچسپی سے خالی ہو رہا تھا اور قید خانوں کی کشش بڑھ رہی تھی۔ دو برس کی مسلسل دعوت اسیری و خواہش پابندی کے باوجود میں ابھی آزاد تھا اس لئے دل مغموم اور ناشاد تھا۔ اپنی شکستہ پانی پر افسوس اور ہم سفرؤں کے منزل مقصود تک رسائی پر رشک آتا تھا۔ دل درد مند کی زاری پرواز پیدا کیا اور یک یک دراجابت کھلا۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت چودھری صاحب گرفتار ہوئے اس وقت تک ہندوستان کے بیشتر حریت پسند جیلوں کو اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ مصنف کی

گزشتہ جیل کے تلخ تجربات، انگریز حاکموں کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک وہاں کی مقید اور پابند زندگی کی تصویر، انگریز تماہندوستانیوں کے سفاکانہ رویے اس خودنوشت کے نصف سے زیادہ حصے پر چھائے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کتاب کا اختتام بھی جیل ہی کے ایک عجیب واقعے کے عنوان کے تحت ہوتا ہے۔ جس جیل میں چودھری صاحب کو رکھا گیا تھا اتفاق سے اسی جیل میں سردار بھگت سنگھ بھی تھے۔ بھگت سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ میری تقریر و ترغیب کی بنا پر تحریک آزادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جیل میں سیاسی قیدیوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گاندھی جی کے "اہنسا" پر گامزن تھا اور دوسرا حسرت موہانی کا ماننے والا۔

چودھری افضل کی خودنوشت "اعمال نامہ" سیاسی ہونے کے باوجود زبان و اسلوب کے اعتبار سے ادبیت کی حامل ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے عہد کے سیاسی حالات اور حریت پسندوں کے جذبات کی مؤثر عکاسی کرتی ہے۔

نواب احمد سعید خاں چغتاری نے "یادِ ایام" کے عنوان سے اپنی خودنوشت تحریر کی تھی۔ "یادِ ایام" سیاسی خودنوشتوں میں ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نواب صاحب کی شخصیت اور ہندوستان کی آزادی اور وطن کے دیگر مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں انہوں نے انگریز حاکموں کی رعوت اور انسان ناشناسی کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں دونوں گول میز کانفرنسوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، جو اس دور کی سیاست پر روشنی ڈالتا ہے۔

نواب چغتاری کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشخاص جنہوں نے ۱۸۵ء کے حادثات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا قصد کر لیا کیونکہ انگریز افسروں کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ بہت اہانت آمیز تھا۔ نواب چغتاری کلکٹر سے ملاقات کے آداب کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس زمانے میں ملاقاتیوں کو خواہ کوئی ہوٹاؤن ہال میں بٹھایا جاتا تھا۔

"ٹاؤن کا ہال کا فاصلہ کلکٹر صاحب کی کوٹھی سے کم از کم ساٹھ گز ہوگا اور

چپراسی کوٹھی کے برآمدے سے کپڑا ہلا کر ملاقاتی کو آواز دیتا اور یہ صاحب

توہ ندا کی آواز پر اقبال و خیزاں چل پڑتے ہیں۔

مستدرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کا رویہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ کتنا تحقیر آمیز تھا۔ نواب صاحب نے صوبہ کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہ انگریزوں کی حکومت میں مختلف منصبوں پر بھی فائز رہے تھے۔ انہوں نے مختلف تحریکوں مثلاً گول میز کانفرنس، تحریک عدم تعاون اور انگریزوں کی ملکی پالیسی وغیرہ کو بڑے معروضی انداز میں بیان کیا ہے۔ تحریک ترک موالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”اس تحریک نے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جس کا اس سے پہلے

مولائے چند حضرات کے فقدان تھا۔ اس سیاسی شعور سے ہندوستانیوں

میں خود آرائی آئی۔ اس تحریک نے انگریزوں کے دماغ سے دعویٰ خدائی

کو بڑی حد تک دور کر دیا اور ان کے مزاج میں اس تحریک نے اعتدال

پیدا کیا، ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی چیزوں کی طرف مائل کیا۔“

”سرگزشت“ عبدالمجید سالک بٹالوی کی خود نوشت ہے۔ اس سرگزشت میں سیاسی

اور ادبی ہندوستان بری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔ سالک نے اپنی خود نوشت میں سیاسی

معلومات فراہم کی ہیں۔ اور اس عہد کے تمام واقعات اور حادثات کو پوری طرح شرح و بسط

کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گاندھی اور رولٹ ایکٹ ۳۰ مارچ ۱۹۰۸ء کی ملک ہڑتال، جلیانوالہ

باغ کا حادثہ، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس، تحریک عدم تعاون، مولانا محمد علی کا وفد یورپ کے

لئے۔ مالویہ جی اور شردھانند کی تحریک، سنگھن اور شرمہ، امرتسر میں تنظیم کانفرنس جس کو ڈاکٹر

سیف الدین کچلو نے منعقد کیا تھا۔ بندے ماترم پرتاپ اور مظاہر کا اجراء، نہرو رپورٹ اور

اس کا رد عمل، اخبار انقلاب اور زمیندار کے مضامین، غرض کہ اس دور کی پوری ملکی اور ملی

تاریخ ان کے فکر و فن کا محور تھی۔ اس طرح سالک کی سرگزشت اپنے دور کے سیاسی حالات

اور تحریکوں کا آئینہ دار ہے۔ سالک نے اپنی سرگزشت میں اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے بارے

میں بھی لکھا ہے۔ ان میں قادر گرامی، محمد اقبال، گاندھی جی، محمد علی جناح، خواجہ لال، رابندر

ناٹھ ٹیگور، مسز اینی بینٹ، خواجہ حسن نظامی، بیدل شاہ، بھال پوری، محمد دین تاثیر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ سیاسی اور صحافتی تاریخ کے طور پر بھی سالک کی سرگزشت بہت اہم ہے۔

عبد اللطیف بٹالوی نے اپنی سیاسی زندگی کی داستان "لطیف کہانی" کے نام سے قلم بند کی۔ عبد اللطیف بٹالوی کا نام ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں خصوصیت کا حامل ہے۔ اپنی خودنوشت میں عبد اللطیف نے اہم سیاسی شخصیتوں مثلاً ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی وغیرہ کے اعمال و افعال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لطیف کی کہانی اس دور کی سیاسی تاریخ کی دستاویز ہے۔ اس خودنوشت میں انہوں نے ۱۹۱۹ء کی بڑتال، شدمی اور نہرو رپورٹ، کانپور انکوائری کمیٹی رپورٹ، ۱۹۳۶ء کا لکیشن، زمینداروں کی حالت، یوپی کی تقسیم کا مسئلہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں نہرو، انصاری، سندر لال شوکت علی، اور پنڈت گوبند بلہ پنت وغیرہ کے خطوط کو بھی رٹ کیا ہے۔ جس سے ان حضرات کی سیاسی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ عبد اللطیف بٹالوی نے سیاست کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس خودنوشت میں ان کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں تمام سیاسی جماعتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اس وقت ملک خطے میں ہے چائنا سرپر بیٹھا ہے معلوم نہیں کل کو کیا حشر ہوگا۔ میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کمیونسٹوں کیخلاف ایک متحدہ محاذ بنائیں اور اپنے اختلافات کو فی الحال بھول جائیں۔"

ڈاکٹر اجندر پرساد نے "اپنی کہانی" کے نام سے خودنوشت لکھی تھی۔ اس خودنوشت کا ترجمہ گوپی ناتھ امن نے کیا تھا اور ساجیہ اکادمی دہلی نے پہلی بار ۱۹۶۱ء میں اس کتاب کو شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر اجندر پرساد خود ایک بڑے سیاست داں تھے۔ انہوں نے آزادی کی تحریکوں میں گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے سیاسی قائدین کے ساتھ رہ کر کام کیا تھا، اور ان تمام تجربات اور تحریکوں کا ذکر انہوں نے "اپنی کہانی" میں کیا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مختلف حصوں میں ستی گرہ کی تحریک جاری تھی، باردولی میں زمین کالگان بڑھانے

کی وجہ سے سستی گرہ ہوا۔ باردولی سستی گرہ کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”باردولی سستی گرہ خوب کامیاب رہا، حکومت نے اپنی طرف سے ہر طرح اسے دبانے کی کوشش کی۔ لوگوں نے بھی جوش کے ساتھ اس جہد و تشدد کو برداشت کیا۔ سختیاں جھیلنے میں عوام کو پوری طرح کامیابی ملی، گاندھی جی کی دعا اور امداد تو شامل حال تھی ہی تحریک چلانے کا سارا بھار حقیقتاً سردار ولجھ بھائی پٹیل پر تھا۔ جنہوں نے سے بڑی فہمندی، استقلال بے خوفی اور محنت سے چلایا تھا۔ سبھی پارٹیوں کے لوگوں نے انتہائی اہم تحریک سمجھا، سب نے مدد بھی دی۔“

اس کتاب میں راجندر پرساد نے پہلی جنگ عظیم، رولٹ ایکٹ، کے خلاف تحریک، پنجاب میں ترک موالات، مولہ بغاوت، سستی گرہ کی تیاری، چوراہوری کا سانحہ، سراج پارٹی کا ختم، ہندو مسلم مسئلے، سائنس کمیشن کی آمد، گاندھی جی کی ڈاڈی یا ترا، نمک سستی گرہ، مسلم لیگ کا قیام وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ راجندر پرساد کی خود نوشت کا ملاحہ کرنے کے بعد سیاسی تحریکات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ راجندر پرساد کا تعلق گاندھی جی سے رہا ہے انہوں نے سیاسی تحریکوں میں گاندھی جی کا ساتھ دیا ہے۔ گاندھی جی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”میں وکات تو زوروں سے کرتا رہا۔ مگر اب گاندھی جی سے بھی تعلق چھیننے والا نہیں تھا۔ رولٹ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد ملک میں ایک بڑی تحریک جاری ہو گئی۔ گاندھی جی نے اس کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لی۔ بہار سے واپسی کے بعد گاندھی جی نے رہنمائی کر کے کھیرا کے کسانوں کا جن پر مال گزاری کا اضافہ تھا، اضافہ چھڑا دیا۔ اور سستی گرہ کا اہتمام کرنا پڑا تھا۔ جب گاندھی جی سنہ ۱۹۱۱ء میں کھیرا کا دورہ کر رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ گجرات کے کسانوں کے اس ضلع میں دو تین دن تک گھوما پھرا تھا۔“

ڈاکٹر راجندر پرساد مولہ بغاوت کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”گاندھی جی نکلے سے مدراس کی طرف چلے گئے۔ اس دورے میں کہیں انہوں نے لنگوٹی پہننے کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی جو درے میں ساتھ والٹر سٹیشن پر گرفتار کر لئے گئے۔ وہ دوسرے کئی لیڈروں کے ساتھ جن میں مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد، شری بھارتی کرشنن اور تیرتھ شنکر اچاریہ بھی تھے۔ کراچی میں خلافت کانگریس کی تقریر اور فتوے کی تبلیغ کے لئے عدالت میں پیش کئے۔ اس مقدمے نے بھی ملک میں بڑی کھلبلی پیدا کر دی۔ مولانا محمد علی نے صفائی میں جو بیان دیا اس کی وجہ سے اور ان صاحبان کے بیان کے سبب سے جو اس میں ملزم تھے، یہ ایک بڑا اہم قدم ہو گیا۔ آخر شری شنکر اچاریہ کو چھوڑ کر سب کو سزائیں ہوئیں۔“

راجندر پرساد کی خود نوشت ”اپنی کہانی“ اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی عادات و کوائف کی آئینہ دار ہے۔

گاندھی جی نے اپنی خود نوشت انگریزی میں لکھی تھی جس کا ترجمہ ”تلاش حق“ کے عنوان سے ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا تھا۔

گاندھی جی نے اپنی خود نوشت میں سیاسی رہنماؤں کی مختلف سیاسی تحریکوں میں شمولیت کا تذکرہ کیا ہے۔ ستیگرہ تحریک کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

”ستیگرہ کی تحریک پہلے شروع ہوئی اور یہ نام بعد میں رکھا گیا۔ جب یہ اصول دریافت ہوا تو مجھے اس کے لئے کوئی نام نہیں ملتا تھا۔ ہم لوگ گجراتی میں بھی اس کے لئے انگریزی لفظ PASSIVE RESISTANCE

د مقاومت مجہول استعمال کرتے تھے جب مجھے یورپیوں کے ایک جلسے میں یہ معلوم ہوا۔ PASSIVE RESISTANCE کے معنی بہت محدود

ہیں۔ یہ کمزوروں کی تلوار بھی جاتی ہے۔ اس میں نفرت، مفہوم بھی آسکتا ہے اور تشدد کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے تو مجھے یہ ظاہر کرنیکی ضرورت

پڑی کہ ہندوستانی تحریک ان چیزوں سے بڑی ہے۔ اور اس کی
 ماہیت بالکل دوسری ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جدوجہد کا صحیح مفہوم
 ادا کرنے کے لئے کوئی نیا لفظ تلاش کرنا ضروری ہے۔ میں نے لاکھ کوشش
 کی مگر مجھے کوئی نیا نام نہیں سوجھا۔ اس لئے میں نے "انڈین اوپینن" میں
 اعلان کیا کہ اس کے پڑھنے والوں میں جو شخص سب اچھا نام تجویز کرے گا
 اسے ایک چھوٹا سا انعام دیا جائے گا۔ جتنا بچہ مگن لال گاندھی نے "ست
 اگرہ" دست یعنی حق اگرہ ثبات کا لفظ وضع کیا مگر میں نے سہولت
 کے خیال سے بدل کر "ستیا گرہ" کر دیا۔ اس وقت سے گجراتی میں اس
 تحریک کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

گاندھی جی کی تحریکوں کے سلسلے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۹۰۸ء میں جب میں نے "ہندو سراج" میں کھڑک کو ہندوستان کے روز
 افزوں افلاس کا علاج قرار دیا، اس وقت تک مجھے کبھی چہ نہ یا کر گھادی کہنے
 کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں میں نے یہ بات ایک بدیہی اصول
 کے طور پر پیش کی کہ جو چیز ہندوستان کو افلاس کی چکی میں پینے سے پہلے
 اس نے گویا سراج قائم کر دیا۔ ہندوستان کا افلاس دور ہوتے ہی سراج
 خود بخود مل جائے گا۔"

گاندھی جی "ترک موالات" کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"مولانا شوکت علی کی فرمائش سے میں نے ریل میں ترک موالات کا رزلیشن

کا مسودہ مرتب کیا۔ اب تک میں نے اپنے مسودے میں

VIOLENT کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس موضوع سے متعلق ابھی میرے الفاظ کا

ذخیرہ مکمل نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مجمع میں

NON VIOLENT کا مترادف سنسکرت لفظ استعمال کرتا ہوں تو لوگ

میرا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اس لئے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا کہ اس کے لئے کوئی اردو کا لفظ بتائیے۔ انہوں نے اس کا ترجمہ ”بالمان“ اور نان کو آپریشن کا ”ترکِ موالات“ تجویز کیا۔

گاندھی جی ”تحریکِ ترکِ موالات“ کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں :-

”میں نے اپنے ریزولوشن میں ترکِ موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے یہ بات وجہاً رکھو چارجی کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا۔

”اگر ترکِ موالات کرنا ہی ہے تو کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرنے کے

لئے کیوں کی جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ سوراج

سے محروم ہے۔ اسی کی چارہ جوئی کے لئے ترکِ موالات کرنا چاہیے

پنڈت نہرو بھی یہی چاہتے تھے کہ ریزولوشن میں سوراج کے

مطالبہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کر لی

اور اپنے ریزولوشن میں سوراج کا مطالبہ بھی شامل کر لیا۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے INDIA WINS FREEDOM کے عنوان سے دو حصوں

پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کے ایک حصے کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد مجیب نے ”ہماری آزادی“ کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کا نصف سے زیادہ حصہ ان کی خود نوشت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ باقی حصہ مولانا کی سیاسی تحریکوں سے وابستگی پر محیط ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی ”میری کہانی“ کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے گول میز کانفرنس، گاندھی جی سے ملاقات، درجنہ نوآبادیات، کامل آزادی، انگریز حکومت کی کارگزاری کے علاوہ سیاسی تحریکوں اور ان تحریکوں میں اپنی شمولیت کا ذکر مفصل طور پر کیا ہے۔

پنڈت نہرو ”میری کہانی“ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

"ہندوستان کا سیاسی اتحاد کو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی گئیں اس کا پس منظر ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ بعد کو جب یہ اتحاد جذبہ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غریبوں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی، جو ہماری ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے۔"

پنڈت نہرو برطانوی حکومت کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں :-
 "برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست، اور مطلب پرست عناصر کی بہت افزائی کرتی ہے مگر یہ بھی ہمارے ملک کے لئے ایک فہروری آزمائش ہے، اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے، جو کھوٹ ورمیں کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے۔"

مولانا حسین احمد مدنی نے "نقش حیات" کے عنوان سے اپنی خود نوشت درجہ اول میں مرتب کی تھی۔ "نقش حیات" کا ایک چوتھائی حصہ مولانا کے شب و روز کی زندگی، والدین، اعزہ اور لواحقین کے حالات پر مشتمل ہے۔ باقی صفحات میں ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم اور استبداد کی داستان پیش کی گئی ہے مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں :-
 "۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ان کے اجداد بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔

"نقش حیات میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مجاہدین یا ان سے تعلق رکھنے والوں یا مشتبہ لوگوں پر مقدمات میں جس قدر نظام ایزاری ساقی، توہین و تذلیل، مار پیٹ وغیرہ خلاف انسانیت اور خلاف تمدن کاروائیاں کی جاتی تھیں، ان کو سنکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ کی تاریخ ان وحشیانہ اعمال کی وجہ سے نہایت گندی اور سیاہ ہے۔ پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ جن امور کا تصور بھی متمدن حکومتوں میں ناجائز

سوانح عمریاں لکھنے کا تصور سب سے پہلے یہودیوں کے یہاں ملتا ہے۔ یہودیوں نے ابتداء میں اپنے اسلاف اور قدما کے حالات زندگی جمع کئے اس کے بعد آہستہ آہستہ اہل روم میں بھی یہ صنف رواج پانے لگی۔ اس طرح دن بدن سوانح عمریاں لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلی سوانح عمری جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی، 'پلوٹارک' کی ہے۔ اس سوانح عمری کو ابظاہر اعلیٰ اور واقع قرار دیا گیا ہے۔

الطاف فاطمہ "فن سوانح نگاری کا ارتقاء" میں سوانح نگاری کے سلسلے میں لکھتی ہیں:-
 "سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔ اس میں لکھنے والا اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ بیرونی کے محاسن اور معائب کو پیش کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کامیاب سوانح نگار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ جس شخصیت پر قلم اٹھا رہا ہے اس کی زندگی کا کوئی بھی اہم گوشہ ضبط تحریر میں لانے سے نہ رہ جائے اور وہ معروضی ہو کر اس کی شخصیت اور سیرت کا بھرپور جائزہ لے۔

الطاف فاطمہ نے ایک اور مقام پر فن سوانح نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔
 ”فن کار کے لئے اس کے فن پارے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ وہ
 اس کے لئے ایک ذریعہ نجات بن جاتا ہے۔ دنوں برسوں کے ڈھکے چھپے
 خیالات اور جذبات اور جو فنکار کی روح و ذہن میں موجزن ہوتے ہیں ان کا
 کاراستہ پالتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ایک ایسے بارعظیم سے سبکدوش ہو جاتا
 ہے جو اس کے قلب و ذہن کو کچلتا ہوتا ہے۔“

اردو فن سوانح نگاری کی ابتداء سر سید احمد خان کے رفقا کی رہنمائی میں ہوئی ہے۔ سر سید احمد
 خان نے غلی گدھ تحریک کے زیر اثر رفقا کا ایک ایسا حلقہ تیار کیا تھا جنہوں نے اپنے اپنے میدانوں
 میں قلم کے جوہر دکھائے۔ اس دور میں جہاں ادب کی دیگر اصناف کو فروغ حاصل ہو رہا تھا وہاں فن سوانح
 نگاری پر بھی توجہ صرف کی گئی۔

سر سید کے رفقا میں مولانا شبلی نے خصوصیت سے تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کو اپنا
 میدان بنایا۔ حالی نے تنقید نگاری اور شاعری کے علاوہ سوانح غمیاں بھی تصنیف کیں۔ انہوں نے یادگار
 غالب، حیات سعدی، اور حیات جاوید تصنیف کی۔ شبلی کے اسلاف کے عظیم کارناموں کو اپنی توجہ کا
 مرکز بنایا، اور ان کے حالات قلم بند کئے۔

سوانح نگاری میں دارالمصنفین کا سوانحی سلسلہ بھی بڑی اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے۔
 اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمن شیروانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین
 احمد ندوی، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا حیرت دہلوی اور عبدالرزاق کانپوری کے
 یہاں بھی حالی اور شبلی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر معین عقیل نے کورہ بالا سوانح نگاروں کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

”ان سوانح نگاروں کا ایک خاص رجحان یہ ہے کہ ان کے پیش نظر سوانح عمری
 محض مقصود بالذات نہیں۔ سوانح نگاروں کا مقصد کچھ اور ہے۔ سوانح عمری
 کو اس مقصد کے لئے ذریعہ اور وسیلہ بنایا گیا ہے۔ ان سب کی نظریں
 اشخاص پر، اشخاص کی حیثیت سے کم پڑتی ہے۔ ان کے دماغی کارناموں

کے اس حصے پر زیادہ پڑتی ہے۔ جس سے اکیلے قومی کے لئے مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس باب میں ہم نے ان سوانح عمریوں کو شامل کیا ہے جو یا تو سیاسی شخصیتوں پر لکھی گئیں یا پھر جن شخصیتوں کا تعلق ملک کی آزادی سے رہا۔

”وقار حیات“ محمد اکرام اللہ خاں ندوی نے مرتب کی تھی جو ۱۹۲۸ء میں منظر عام پر آئی۔ قائد اعظم محمد علی جناح پر متعدد کتابیں لکھی گئیں ان کتابوں میں سے زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں جو نئی اور سیاہی اعتبار کا میاب اور بھرپور نظر آتی ہیں۔ ”حیات محمد علی جناح“ رئیس احمد جعفری نے لکھی تھی جو ۱۹۲۸ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اسی طرح ایک سوانح عمری خالد اختر افغانی نے ”حالات قائد اعظم“ کے عنوان سے تحریر کی تھی یہ کتاب بھی بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ ”ایشیاء کی سب سے بڑی شخصیت“ محمد علی جناح کے نام سے محمد عبداللہ منہاس نے ایک سوانح تصنیف کی جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں قائد اعظم کی شخصیت کو سیاہی اور قومی رہنما کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے اس طرح کی کتابیں سوانح عمریوں کی شکل میں کثرت سے لکھی گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام جنگ آزادی ہند کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک کثیر الجہات اور مہذب اصناف شخصیت کے مالک تھے۔ ابوالکلام آزاد پر بھی کثرت کے ساتھ کتابیں اور سوانح عمریاں تصنیف کی گئیں۔ ان کتابوں میں مولانا کے سیاسی افکار اور نظریات کو بالخصوص بیان کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا شائق احمد عثمانی کی کتاب ”امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد“ ہے جو ۱۹۳۵ء میں ملکت سے شائع ہوئی۔

معین عقیل مذکورہ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”اس کتاب کے ابتدائی صفحات ”آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی“ مرتبہ عبدالرزاق طبع آبادی کے غلام سے پر مشتمل ہے۔ طبع آبادی کی مرتبہ کتاب میں اس کے بعد ۱۹۲۳ء کے حالات ہیں۔ اس کتاب میں مولانا کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور صحافتی زندگی، علم و فضل اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔“

عبدالشریف نے "ابوالکلام آزاد" کے نام سے اردو میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لاہور سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی حیات، تصنیفات اور ان کے سیاسی کارناموں پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسری کتاب جو مولانا آزاد پر مختلف افراد کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے لاہور سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ "ابوالکلام آزاد" کے نام سے روشنی مولانا آزاد کے خاندانی حالات، سوانح حیات، علمی، مذہبی اور سیاسی خدمات کے تعارف پر مبنی کتاب تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے مفصل حالات البلال کے مفید مضامین، مختصر مقدمہ کراچی اور خطبہ صدارت شامل ہیں۔ منشی عبد الرحمن شیدا نے "سوانح ابوالکلام آزاد" تصنیف کی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کے ابتدائی حالات سے ۱۹۴۱ء تک کے حالات علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آصف علی نے "سوانح ابوالکلام آزاد" تحریر کی۔ یہ بھی مولانا آزاد کے علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آخر میں آل انڈیا سٹیل کانگریس کے ۵۳ ویں اجلاس منعقدہ رام گڑھ کا خطبہ صدارت بھی شامل ہے۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ابوسعید بزمی نے "مولانا ابوالکلام" تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی علمی، مذہبی، سیاسی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

علامہ اقبال پر بھی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ علامہ اقبال شاعر، فلسفی، اور مفکر ہونیکے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھے۔ انہیں اپنے ملک سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا۔ محمد دین تاثیر نے "اقبال پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک ایک کتاب لکھی تھی، جو ۱۹۳۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ عنایت اللہ نے "حیات اقبال" لکھی جو ۱۹۳۹ء میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اقبال پر متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں اقبال کے سیاسی اور ادبی کارناموں کا تذکرہ بالخصوص ملتا ہے۔

سوانح عمریوں کے علاوہ چند ایسی کتابیں بھی ضبط تحریر میں آئیں جن میں علماء اور قائدین کے تذکرے لکھے گئے ان کو مجموعی سوانح کے ضمن میں تحریر کیا جاسکتا ہے۔

مولانا محسن مہیا کی کتاب "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" خاص طور پر قابل

ذکر میں۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات اور قائدین کی سیاسی و مذہبی فکر و شعور کا ذکر ملتا ہے۔ ان علماء میں مولانا محمود الحسن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا نور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے سیاسی نظریات سامنے آتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی پر محمد سرور کی ایک کتاب ملتی ہے جس کا سن اشاعت ۱۹۴۳ء درج ہے۔ اس کتاب میں عبید اللہ سندھی کا سیاسی نظریہ اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مہادیو ڈوسائی نے "خدائی خدمت گار" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا اردو ترجمہ محمود علی خان نے کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں صوبہ سرحد و دہشت گردانہ کے باشندوں کی زندگی کے اہم واقعات سیاسی اور مذہبی خیالات کو مکالموں کی شکل میں تحریر کیا گیا ہے۔

محمد عنایت اللہ نے "تذکرہ فرنگی محل" بھی لکھی۔ جو پختونستان سے متعلق شائع ہوئی۔ اس میں قندھار اور وادی حاکم کے علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے اور فرنگی محل سے حق رکھنے والے وہ علماء بھی شامل تھے، جو اس دور کے سیاسی تحریکوں میں انگریزوں کے خلاف حصہ لے رہے تھے۔

سیاسی رہنماؤں، مبلغین، قائدین پر سوانحی کتب کا سلسلہ بھی سنہ ۱۹۴۷ء میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح کی کتب میں مہری کی کتاب "ہندوستانی بیڈر ہے" اس کتاب میں کانگریس دور میں ایک سے متعلق سیاسی رہنماؤں کا مختصر تذکرہ کیا گیا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ جگدیش سنگھ نے "محبانِ وطن" تحریر کی تھی، اس میں ہندوستانی رہنماؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ بادشاہ حسین نے مشاہیر ہند، دو جلدوں میں تحریر کی تھی۔ ۱۹۴۷ء حیدر آباد دکن سے طبع ہوئی تھی اس میں مختلف نظریات و مذاہب کے حامل قومی و سیاسی اکابرین کا ذکر کیا گیا ہے۔ "ہائی بیڈر" کے نام سے قوم پرست قائدین کے حیات و زندگی

مختلف اکابرین نے تحریر کئے تھے۔ اس کتاب کے مرتبین میں سچا یہ کربلائی، کے۔ ایم منشی، ویر یوسف میر علی شامل تھے۔ اس میں اس دور کے اہم ورناموں و قوم پرستوں کے مختلف حیات و تحریر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی لاہور ہی سے شائع ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ مالویہ جی، لالہ لاجپت رائے، سر دھنی ناٹھو، ٹیگور، سریندر ناتھ بنرجی، گوکھلے، ڈاکٹر ذاکر حسین، مختار احمد انصاری، حکیم اجمل غاں وغیرہ سیاسی رہنماؤں پر متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جو سوانح عمریوں کی شکل میں ہمارے سامنے آئیں۔ ان کتابوں میں سیاسی رہنماؤں کے کارناموں نیز مسلم قوم کے تئیں ان کی سیاسی خدمات کا ذکر ملتا ہے۔



تحریک آزادی



اُردو صحافت

افراد سے اقوام کی تشکیل ہوتی ہے، فرد اور قوم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ فرد کے بغیر قوم کا تصور ممکن نہیں۔ کسی قوم کے شعور کی بیداری میں اس عہد کے ماحول اور ادب دونوں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ جب ہم ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں اس عہد کے پُر آشوب حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اخبارات نے ہندوستانی عوام و خواص کو ایک پلیٹ پر لانے اور ملکی شعور کو ایک خاص تحریک کی جانب راجع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

عقیق صدیقی ہندوستانی اخباروں کا جائزہ لیتے ہوئے نٹ راجن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”انیسویں صدی کی چھٹی دہائی ہندوستان کی برطانوی تاریخ کا ایک اہم ترین زمانہ ہے۔ برطانوی ملک گیری کا جو سلسلہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں شروع ہوا تھا۔ پورے سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں اودھ کے خاتمے پر اس کی تکمیل ہو گئی۔ اس موقع پر ہندوستانیوں نے ایک عظیم بغاوت کی شکل میں پلاسی کے قوی سامنے کی صد سالہ برسی کی۔ اس بغاوت کو جسے انگریزوں نے غدر کا مہل نام دیا تھا بروئے کار لانے میں ہندوستانی اخباروں نے نمایاں حصہ لیا۔“

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اردو صحافت کا ایک خاص دور شروع ہوتا ہے۔ خورشید علی نظامی کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ:

”ابتداء میں اردو اخباروں کا لب و لہجہ نرم اور مسہمت وقت کے تابع تھا و زیادہ تر اخبارات کی توجہ سیاست کی جگہ مغربی علوم و فنون کی اشاعت پر مرکوز تھی۔ ملکی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے کھل کر تاج برطانیہ کے زیرِ نگیں آگئی تو حکمران طبقے کے طرز عمل میں کچھ بہتری کے آثار نظر آنے لگے اور اخبارات بھی ملکی مسائل پر دینی ہوئی زبان میں رائے زنی کرنے لگے۔“

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے مسلسل سفاکانہ رویے سے ہندوستانی عوام اور سپاہ متغیر ہو چکی تھی اور انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بند کرنے کا مقصد ارادہ کر لیا تھا۔ ۳۱ مئی اس کی تاریخ طے پائی تھی لیکن میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہوسکا۔ ۱۰ مئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز انسپر پر گولی چلا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبل از وقت جنگ چھڑ گئی۔ اردو اخبار پہلے ہی اس تحریک کو پیش کر کے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کر چکے تھے۔ اور ان کے دلوں میں آزادی کا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔

ملک گیر سطح پر وقوع پذیر ہونے والی اس تحریک کے دوران لارڈ کیسنگ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ کیننگ ہندوستانی اخباروں کا مزاج سمجھ چکا تھا اس نے اس سلسلے میں کہا تھا:-

”ایسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔“

اس باب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک کے ان اخبارات کو اور رسائل کو شامل کیا گیا ہے جو خالص سیاسی تھے اور جنہوں نے قومی شعور کو بیدار کرنے و جنگ آزادی کے لئے زمین ہموار کرنے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اس دور کے اخبارات میں مولانا محمد باقر کا ”دلی رسدو اخبار“، سحر سامری، ”منشی نواز کشور کا اردو اخبار“، کنڈال کا ”تاریخ بغاوت اگرہ“، عبدالرحمن کاشف کا اخبار ”صبح“، نصیر الدین آفندی کا ”شمس اخبار“، مدراس ”ابودھیا“، پراساد کا ”خیر خواہ خلق“، امیر ”حیدر علی“ کا ”شطہ طور“، کانپور ”محمد منصور کا منظور اخبار“

لے خورشید عبدالسلام، مہانت پاکستان دہندہ، ۱۹۶۳ء، ص ۷۷۔ لے عتیق مدنی، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۵۹۔

اگرہ ۱۸۶۱ء، میر فتح اللہ کا "کوٹہ گزٹ" ۱۸۶۰ء، امر اعلیٰ کا ہفتہ وار "اخبار عالمتاب" اگرہ ۱۸۶۱ء،
 منشی امان علی کا ہفتہ وار "کشف الاخبار" بمبئی ۱۸۶۱ء، منشی عبدالعلیم کا "اخبار عالم" میرٹھ ۱۸۶۱ء،
 منشی دھر کا "آب حیات" ۱۸۶۲ء، محمد اکبر کا "عمدۃ الاخبار" ۱۸۶۳ء، اسماعیل خاں کا "لارنس گزٹ"
 میرٹھ ۱۸۶۳ء، محمد قاسم کا "قاسم الاخبار" بنگلور ۱۸۶۵ء، جمیل الدین کا "صادق الاخبار" دہلی ۱۸۶۵ء،
 ۱۸۶۶ء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا اخباروں کا طرز تحریر، زبان و بیان لب و لہجہ براہ راست اور بالواسطہ طور پر انگریزوں
 کے خلاف ہی نہیں بلکہ تلخ بھی ہوتا تھا۔ اردو اخباروں نے قومی شعور کو بیدار کرنے، عوام کے دلوں میں
 آزادی کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے ارادوں کو مستحکم بنانے میں اہم اور موثر رول ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت
 صغریٰ کے فرو ہونے کے بعد بیرون پر منہلم توڑے گئے۔ انہیں پھنسیا دی گئیں۔ ان کے مطابق
 ضبط کر لئے گئے لیکن انہوں نے ہنستے ہوئے ان تمام مظالم کو برداشت کیا اور ملک کے لئے جان کی
 بازی لگا دی۔

"دلی اردو اخبار" ۱۸۵۷ء میں بند ہو گیا۔ اس اخبار کو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد
 باقر نکالتے تھے۔ یہ اس دور کا مقبول اخبار تھا۔ لیکن یہ انگریزوں کے غتاب سے نہ بچ سکا۔ امداد صابری
 "روح صحافت" میں لکھتے ہیں :-

"دہلی میں جب تک جنگ آزادی جاری رہی اس وقت تک "دہلی اردو اخبار"
 نے نہ صرف اپنے صفحات آزادی کو کامیاب کرنے کے لئے وقف کر رکھے
 تھے بلکہ اس کے بانی مولانا محمد باقر نے قلم کی جنگ کے علاوہ تلوار سے بھی
 انگریزوں سے جنگ لڑی اور جس وقت جنگ ناکام ہوئی اور انگریز دہلی پر قابض
 ہو گئے تو اخبار بند ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد باقر انگریزوں کی گولی کا نشانہ
 بنے اور جام شہادت نوش کیا۔"

"دہلی اردو اخبار کا نام آخری دنوں میں بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام کی نسبت
 سے اخبار الظفر تجویز کیا تھا۔ اس نام سے "دلی اردو اخبار" کے صرف

دس شمارے دستیاب ہو سکے ہیں۔

آخری شمارے میں یہ خبر قابل ذکر ہے۔

..... چار دن سے خوب بڑائی، قوی و غلبہ کی ہو رہی ہے۔ کفار نے نئے

مورچے بنائے اور سے بھی مورچے جو پہلے بنے تھے۔ مجلاتنا بس ہے کہ

انشاء اللہ صبح دشا متاں پیرا نیدو قہار، قدرت قادر ذوال جبر سے فتح سلام

و ہلاکت کفار نمایاں ہوتی ہے۔

اس دور کے اخباروں میں "اودھ خبر" بھی ایک اہم اخبار تھا۔ یہ اخبار مشی خیر کتب کی ادارت

میں لکھنؤ میں معرض وجود میں آیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار لینے عہد کی ذہنی ترقی و معاشی اور سیاسی ترقی

کی مستند اور باوقار دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اپنے عہد کے حاکموں پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ لیکن اپنی

ممانعت کو برقرار رکھتے ہوئے، اودھ اخبار نے سندھ دستاویزوں کے ذہن میں قوی بیداری پیدا کی

جس کا ثبوت اس کے مختلف شماروں میں مل جاتا ہے۔

اودھ اخبار کے بارے میں گارساں داسی نے ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا۔

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس کی

ہر اشاعت پہلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی تصحیح و تصنیف کی تعداد

بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور چار شنبہ کو شائع ہوتا ہے شروع

شروع میں اس میں صرف چار صفحے شائع ہو کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تصحیح

پر چھپے ہوئے اور پھر سولہ اور اب اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے پہلے

کے مقابلے میں اس کی تصحیح بڑی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ

مفہم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے۔

اودھ اخبار حکومت کی براعظموں اور اس کی حکمت عملی پر تنقید کرتا تھا۔ اس میں جاں نثاران

وطن کی قربانیوں کی داستانیں بھی پیش کی جاتی تھیں۔ اس کے لکھنے والوں میں اردو کے معروف ادیب

اور شاعر اور انشا پرداز مشلا رتن ناتھ سرشار، سید احمد شہری اور مرزا جیت دہلوی، مولانا

جالب دہلوی، احمد حسن تنوکی اور غلام محمد خاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ قومی شعور کی بیداری میں اودھ اخبار کی بڑبڑ اور دلولہ انگیز تحریروں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ سیدار کرنے میں جرنی والے کارکنوں کا سانچہ بھی بڑا اہم ہے۔ "صادق الاخبار" کے ایک شمارے میں اس واقعہ سے متعلق خبر درج ذیل الفاظ میں دی گئی ہے۔

"ان دنوں تمام سپاہ سرکار نے نئے نئے کارکنوں سے سرتابی کرنا شروع کر دی

ہے۔ چنانچہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال میں کچھ پلٹنیں پھر گئی تھیں، ایک ت میں

سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پچاسی کا حکم ہوا تھا۔۔۔۔۔ پلٹنیں

گورکھا نمبر ۱۶ مقیم انبالہ نے بروقت قواعد عمل درآمد سے انکار کر دیا۔۔۔۔۔

.. از روئے ایک تھی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے

کارکنوں کی قواعد سے ٹکراتے ہیں اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے

کارکنوں توڑتے ہیں لوگوں کے دل کا شک باطل رفع نہیں ہوا۔"

عتیق احمد صدیقی "صادق الاخبار" کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :-

"دہلی کا سب سے زیادہ قابل ذکر اخبار "صادق الاخبار" تھا جس نے

بغاوت کے جذبات کی تخم ریزی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اور جس نے بغاوت کے دوران

میں باغیوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی تھی۔"

"صادق الاخبار" جنگ آزادی میں پیش پیش رہا۔ اس نے اپنی وسیع تحریروں کے ذریعے ہندوستان

کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ یہ اخبار عوام و خوام میں از حد مقبول تھا۔

اس زمانے کے اردو اخباروں کے مختلف شماروں میں غدر کے حالات میری نظروں سے گزرے

میں۔ یہ اخبارات فینٹل آرکائیوز آف انڈیا، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں موجود ہیں۔ ان اخباروں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے

اوائل ہی سے بغاوت کے اثرات رونما ہونے لگے تھے اور اخباروں کا لب و لہجہ تند و تیز اور تلخ

ہونے لگا تھا۔

"سلطان الاخبار" اپنے ایک شمارے میں لکھتا ہے :-

”ہمارا ملک اگر لیں گے جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلافت عہد و یہاں اگر ریاست
 لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سر میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے جس
 دم معرکہ کا زار کی گرم بازاری ہوگی دیکھ لینا کسی ذلت و خواری ہوگی“

لکھنؤ سے ایک اخبار ”سحر سامری“ ۱ نومبر ۱۹۵۷ء کو جاری ہوا یہ اخبار اپنے ۵ ارب ۵۷ لاکھ
 شمارے میں اس دور کے حالات اور حکمران کی براہمنیوں کا انکشاف کرتے ہوئے لکھا ہے۔
 ”ان دنوں غلہ کی گرنی ہے۔۔۔۔۔ بے معنی نے برقیات کے آدمی کا امین
 کھودیا۔۔۔۔۔ ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا۔۔۔۔۔ حاکم
 اس طرف عنان توجہ پھیرتا نہیں“

امداد صابری کی فراہم کردہ حقائق کے مطابق کشف و اخبار بھی سے مستحقان علی نکالتے تھے
 اس میں خبروں کے علاوہ معاشی واقعات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا اور حکومت کے مختلف محکموں کی بدعنوانیوں کے
 خلاف آواز بھی اٹھاتا تھا بلکہ

”تاریخ بغاوت ہند“ بھی اسی دور کا اخبار تھا جو ۱۹۵۷ء میں گوردے جاری ہوا۔ اس میں
 سلسلہ دار ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں رونما ہونے والے جنگ آزادی کے واقعات
 شائع ہوتے تھے۔ ”شعلہ طور“ بھی ایک اہم اخبار تھا۔ اس میں عام طور پر معاشرتی اور سیاسی واقعات کے
 بارے میں خبریں شائع ہوتی تھیں اور انقلاب پسندوں کے حالات درج ہوتے تھے جن میں انقلابیوں کے
 ساتھ زیادتی، نا انصافی اور ظلم و استبداد کو واضح طور پر بیان کیا جاتا تھا، غدر کے بعد خصوصاً مسلمانوں
 کو مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۷ء کے شمارے میں ”شعلہ طور“ بہادر شاہ کے وزیر
 حکیم نواب حیات الدوار کی داستان غم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”حکیم صاحب پر بغاوت کا شک تھا کہ غدر میں شریک تھے اور بعد غدر کے اٹھارہ
 عزیز و قریب مثل بیٹیوں، پوتوں کے سر کاٹنے گرفتار کر کے گویوں سے مار
 دیئے جو بیشتر دولت تھی و دلٹ گئی۔ اور ان کا عمدہ محل سرکار میں ضبط ہو گیا۔
 ان کی زندگی مصیبت میں گزرنے لگی۔ اور درحقیقت ان کا حال قابلِ رحم

تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی وغیرہ کو دو دو روز فاقے سے گزر جاتے تھے جب سرکار نے اشتہار دیا کہ جو شخص چاہے دہلی میں آئے مگر پھر گرفتار ہوئے ان کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی لیکن عوام بیوت میں برے ہوئے اور کچھ جائیداد مثل مکان اور دوکان کے واپس ملیں آٹھ مہینے تک اس جائیداد پر قابض رہے بعد اس کے جب ایک جدید ڈپٹی کمشنر آئے تو پھر محبذوں نے کہا، ہم نواب صاحب پر فرد جرم ثابت کر سکتے ہیں، چنانچہ کمشنر نے گورنمنٹ میں رپورٹ کی اور جائیداد پھر ضبط ہو گئی اور نواب صاحب پھر مفلس ہو گئے۔ سولہ سال تک متواتر انہوں نے سپریم کورٹ میں عرضیاں گذاریں مگر کچھ سماعت نہ ہوئی اور نواب صاحب کسی زمانے میں کروڑ پتی تھے فقیر سے بھی بدتر ہو گئے۔

غدر کے فروغ ہونے کے بعد انگریزوں کی انتظامی کاروائی کا سلسلہ شروع ہو گیا جو برسوں تک جاری رہا۔ اس پُر آشوب دور میں یعنی ۱۸۶۶ء میں رامپور سے "دبدبہ سکندری" منظر عام پر آیا۔ یہ اخبار نواب بہ علی خاں رامپور کی ایما پر جاری کیا گیا تھا۔ اس اخبار میں اس دور کے ہنگاموں اور سیاسی معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ امداد صابری دبدبہ سکندری کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس (دبدبہ سکندری) میں غیر ملکی خبریں زیادہ جگہ پاتی تھیں۔ انگریز حکومت کے خلاف افغانستان میں جو بغاوتیں ہوتی رہیں اس اخبار میں ان کی تفصیلات گاہے گاہے شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار روس کی سیاسی حکمت عملیوں کا بھی مخالف تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے عزائم پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ ملکی مسائل پر بعض اوقات مناسب موقعوں پر حکومت کی غلط کاریوں پر ٹوکتا تھا۔ اس کی اشاعت میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کا حال درج ہے۔"

اس دور کے اخبارات میں ایک اخبار "آفتاب عالمیاب" شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کو امر او علی نے اگرہ سے ۱۸۶۶ء میں ہفتہ وار جاری کیا تھا۔ اس میں سیاسی خبروں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے حالات بھی درج ہوتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں "اخبار عالم" لاہور سے نکلتا شروع ہوا تھا۔ یہ اخبار حکومت کے بدانتظامیوں پر نکتہ چینی کرتا تھا اور حاکموں کے جانب دارانہ رویے کی نقاب کشائی کرتا تھا۔ "اتاق ہند" کا ذکر بھی ضمنی طور پر کرنا ضروری ہے۔ "اتاق ہند" ۱۸۵۸ء میں لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا تھا۔ یہ اخبار حکومت کو مشورے دیتا اور عوام میں ہندو مسلم اتحاد پیدا کرتا تھا۔

"تسلیم" اگرچہ یکم جنوری ۱۸۵۷ء کو جاری ہوا تھا اس اخبار کو منشی لال نکالتے تھے۔ تسلیم اگرچہ میں اندرون ملک کے علاوہ غیر ممالک کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ہندوستانیوں کے سیاسی اتصال کے علاوہ انگریزوں نے ان کے سماجی و مذہبی معاملات میں دخل اندازی ہونا شروع کر دیا۔ انکے ذہنوں کو بدلنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے گئے۔ مسیحیت کی تبلیغ زور شور سے شروع کر دی گئی۔ انگریزوں کی اس حکومت نے ہندوستانیوں کے دلوں میں غام طور پر نفرت اور غم و غصہ پیدا کر دیا۔ "تسلیم" اگرچہ ۶ جنوری ۱۸۵۷ء کے شمارے میں ان کے افعال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے

"اب تو حد گزر گئی کہ ہر طرح کے افعال واسطے درغلانے اور ناپاک کرنے کے پیدا کرتے جاتے ہیں۔ انجیل کی تسلیم اور منادی سے پیٹ نہ بھرا تو اسکول جاری کئے۔ اتوار سے انجیل کی پڑھائی روزمرہ کی گئی پھر بھی سننا نہ گئے تب مستورات میں میم لوگ بھی سننا نہ بھلا دست کاری جانے لگیں۔ پھر بازاروں اور میلوں میں جا کر کرسمس بھیج گلانے لگے پھر باجائیکر لوگوں کو متوجہ کیا اور وہ بھی کچھ تعجبات میں سے نہیں معلوم ہوا یعنی سوائے قحط زدوں کے بہت کم خوشی سے کرسمس ہوئے پھر گیر واک پر سے پہنچے ... اور مدرسوں سے جیب کام خاطر خواندہ نکلا تو اب ہسپتال ہو گئے ہیں مردانہ بھی زنانہ بھی"۔

انیسویں صدی کے اوخر میں یعنی ۱۸۹۵ء میں امرتسر سے اخبار "وکیل" کا اجراء عمل میں آیا۔ اس کے مہتمم شیخ غلام حسد تھے۔ اس اخبار کی خدمات جن مدیروں نے کیے بعد دی گئے انجام دیں گے نام اس طرح ہیں۔ مرزا اجالب دہلوی، مولوی انشاء اللہ خاں اشرا، مولوی عبدالستار منہاس، مولوی محمد شجاع اللہ حکیم فیروز الدین فیروز۔

اخبار "وکیل" کی زبان سلیس ہوتی تھی۔ اس میں فہمی حارت و دو قعات پر تبصرے شائع ہوتے

تھے۔ شیخ اگرچہ شمارہ ۳ جنوری ۱۸۹۵ء

تھے۔ ملکی اور غیر ملکی دونوں طرح کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر اخبار "وکیل" کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

"وکیل" اردو صحافت کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے خیالات ہمیشہ دانشمندانہ اور پُر وقار رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ذہنی رواداری کا منظر تھی اور یہ وہ خوبی ہے جو اس دور کے بہترین انگریزی اخباروں میں بھی شاذ ہی ملتی ہے۔

"وکیل" کو بیسویں صدی کے اوائل میں خامی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی اپنے رسالے "اردوئے معلیٰ" کے ۱۱ ص ۹۱ کے شمارے میں اخبار وکیل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"زبان کی صحت اور لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے زمیندار کی طرح وکیل بھی ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے ایڈیٹریل مضامین کی آزادی کا مقابلہ نسبتاً کوئی دوسرا اسلامی اخبار نہیں کر سکتا۔ مثلاً ۱۹ اپریل کے پرچے میں مسلم یونیورسٹی اور عام رائے مطالبہ پر ایک قابل قدر مضمون لکھا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قائم ہونے والی مسلم یونیورسٹی کو بہر صورت حکومت کی ماتحتی سے آزاد رہنا چاہیے اُس کا چانسلر مسلمان ہو اور اس کی عنان حکومت مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہے اور سب سے زیادہ اس کی تعلیمی زبان اردو رکھی جائے۔"

ان دنوں سرکاریہ غور کر رہی تھی کہ جو اخبارات باغیانہ مضامین لکھ رہے ہیں ان پر پابندی لگائی جائے اور افسران بالا کو یہ اختیارات دے دیئے جائیں کہ وہ اس قسم کے اخباروں کو ڈاک خانے ہی میں روک لیں۔ ۲۱ جنوری ۱۹۹۰ء کے شمارے میں "وکیل" حکومت کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"سرکار چاہتی ہے کہ ڈاک خانے کے ذریعے معاندانہ مضامین کی اشاعت نہ ہو اس وجہ سے ڈاک خانے کے افسروں کو اختیار دے گی کہ جس تحریر

کو باغی سمجھیں بذریعہ ڈاک خانہ جانے سے روک دیں۔ سوال یہ ہے کہ فیصلہ کونسل کرے گی کہ کوئی تحریر باغیانہ ہے یا نہیں، ڈاک خانے میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے ملک کے حقوق پامال کر کے اس کے خواہاں نہ ہوتے ہوں کہ سرکار ان کے ساتھ رعایت کرے، کیا ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی آزادی چھوڑ دی جائیگی۔ جدید قانون ڈاک خانے میں جو اس وقت کونسل وائسرایس میں پیش ہے، علاوہ متذکرہ بالا دفعہ کے یہ بھی ایک دفعہ جدید پڑھائی جائے گی کہ جس وقت ملک میں کوئی عام شورش دیکھی جائے۔ اس وقت انسران ڈاک خانے کو اختیار حاصل ہونگے کہ وہ جس تحریر یا مطبوعہ کو چاہیں گے روک دیں گے اس امر کے فیصلے کے لئے کہ آیا اس کا وقت آگیا ہے یا نہیں کہ کاغذات کی اجازت رد کی جائے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ سیکریٹری آف اسٹیٹ نے انڈیا آفس کی خواہش سے حکم دیا ہے کہ کوئی کاغذ کنیڈا سے ہندوستان کو ایسا نہ بھیجا جائے جس سے بغاوت ہو جائے۔

اس دور کے اخباروں میں "کرزن گزٹ" ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کرزن گزٹ سنہ ۱۹ میں کلاں محل دہلی سے ہفتہ وار نکلتا شروع ہوا تھا۔ جو میں صفحات مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے مالک و مدیر مزاحیرت ایک حق پسند اور میاں صاحب تھے۔ حکومت کے کاسہ لیسوں پر نکتہ چینی کرنے نیز حکومت کی نا انصافیوں اور بد اعمالیوں کی نقاب کشائی کرتے تھے۔ اس کے مدیر کو باغیانہ مضامین لکھنے کی یادداشت میں بڑی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن ان کی روش میں کوئی فرق نہیں آیا۔

بیسویں صدی کے اوائل سے آزادی ہند تک

بیسویں صدی کے اوائل میں نئی قومی تحریکوں نے جنم لیا۔ بنگال کی تقسیم، مسلم لیگ اور ہندو سماج کا قیام بھی اسی دور میں عمل میں آیا۔ دوسری دہائی میں انڈین نیشنل کانگریس میں کچھ گرمی کے آثار نظر

آنے لگے۔ پہلی جنگِ عظیم، ہوم رول لیگ، خلافت تحریک جیسی تحریکوں نے جنم لیا۔ تمام سیاسی سرگرمیوں کے اثرات اردو صحافت نے بھی براہِ راست طور پر قبول کئے۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں نکلنے والے اخباروں میں "وطن" اخبار کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اخبار سنہ ۱۹۰۴ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر مولوی انصار اللہ تھے۔ ابتداء میں اخبار مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حقوق کے تحفظ سے بحث کرتا تھا البتہ سنہ ۱۹۰۶ء سے اس کی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس میں تحریک آزادی کے سلسلے میں مضامین شائع ہونے لگے جو حکومت کے خلاف تھے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں "وطن" اخبار بند ہو گیا۔

"ترقی" سنہ ۱۹۰۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاسوں کی کاروائیاں چھپتی تھیں۔ جنوری سنہ ۱۹۰۵ء کے شمارے میں ایک اجلاس کی مختصر کاروائی شائع ہوئی، جو حسبِ ذیل ہیں:-

"انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس بھی اسی سال (۱۹۰۵-۸) میں ہوا مگر امن و امان گزشتہ سالوں کی مانند خوبی کے ساتھ نہیں، کیونکہ اختلافِ رائے کے باعث اعتدال پسند اور انتہا پسند فریق میں خراب جھگڑا فساد ہوا۔ زیادتی انتہا پسندوں کی تھی۔ اس فریق کا پروگرام یہ ہے کہ حکمران سے رعایت طلب نہ کرو، قانونی حدود سے باہر اگنی میشن کرو، انگریزی چیزوں کو یک قلم چھوڑ دو، نہ گورنمنٹ کی ملازمت کرو، نہ سرکاری کونسلوں اور ڈسٹرکٹ میونسپل بورڈ کی ممبریاں، انگریزی عدالت سے انصاف نہ کراؤ، بد رسوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل نہ کراؤ۔"

ماہنامہ "زمانہ" سنہ ۱۹۰۶ء میں کانپور سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر شیو برت لال تھے۔ اس میں سیاست، معاشیات، مذہبیات، اخلاقیات، طنزیات، نفسیات، لسانیات سے متعلق مضامین اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کا ایک کالم، "رفتارِ زمانہ" کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ اپنے دور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے "زمانہ" جنوری سنہ ۱۹۰۷ء کے شمارے میں لکھتا ہے:-

"بغاوت کے بعد انگریزوں کو ہندوستانیوں سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ انگریزوں کو بڑے سے بڑا جرم کرنے پر بھی کوئی خاص سزا نہ دی جاتی تھی اس کے برعکس

اگر کوئی ہندوستانی چھڑا سا بھی جرم کرتا تو اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔
 جنوری ۱۹۰۷ء ہی کے شمارے میں انگریزوں کی نا انصافیوں کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے :-
 ”آج کل سرکاری تشدد کا زمانہ ہے گورنمنٹ اور قوم برطانیہ کو بغاوت کا بھوت
 ستا رہا ہے، اور سرکار اس سے مقابلہ کرنے کے لئے نئے قانون وضع کرنے
 پر تلی مٹی ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے آہنی شکنجے تیار کئے جا رہے ہیں
 تاکہ ان کے ہاتھ پیر بندھنے کے علاوہ زبان بھی بند ہو جائے۔“
 معین عقیل بیسویں صدی کے اوائل کی صحافت کا مزاج اس دور کے سیاسی مناظر میں اس طرح
 بیان کرتے ہیں :-

”بیسویں صدی کی صحافت کا لازمی مزاج سیاست تھا۔ مختلف سیاسی تحریکات، جموں
 اور ہنگاموں میں اخبارات سیاسی ماحول کے تقاضوں سے دور نہیں رہ سکتے
 تھے۔ چنانچہ ہر اخبار کا اپنا سیاسی نقطہ نظر ہوتا تھا۔ سیاست کی طرح صحافت
 بھی دو مختلف راہوں پر گامزن تھی۔ ایک متحدہ قومیت کے نظریے کے ساتھ،
 اور دوسری علیحدہ مسلم قومیت کے تصور کے ساتھ، بعض اخبار اس ذیل میں زباؤں
 مستعد اور ہنگامہ خیز رہے..... اخبارات نے اپنے دور کے سیاسی ماحول کو
 مثالی حد تک متاثر کیا۔ ان کا یہ انداز تقسیم ہند تک مستقل اور روز افزوں رہا۔ ایسے
 اخبارات میں ”الہلال“ اور ”ہمدرد“ دورِ اوّل ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔“

زمیندار جون سنہ ۱۹۰۹ء میں لاہور سے مولانا سراج الدین نے جاری کیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء ہی میں مولانا
 سراج الدین کی وفات ہو گئی اور ان کے فرزند مولانا ظفر علی خاں نے اس کو جاری رکھا۔ زمیندار عوام
 میں بہت مقبول تھا۔ زمیندار کے انداز و اسلوب کے بارے میں خورشید عبدالسلام لکھتے ہیں
 ”اس دور کے سیاسی اداریے بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز اور میاکی طوفانی
 سیاست کی غماز ہیں۔ اس نے عوام کے دلوں میں غیر مکی حکومت کا خوف دور
 کیا اور صداقت پر رہ کر اپنی بات کہنے کا درس دیا..... یہ اخبار سنہ ۱۹۳۶ء

تک قوم پرست اور کانگریسی نقطہ نظر کا حامل رہا۔ اس کا خیال تھا کہ کانگریس ملک کی متحدہ قومی جماعت ہے اس کے زیر سایہ ملکی آزادی کے لئے جدوجہد ہو سکتی ہے، بغرض کہ ہر اعتبار سے زمیندار کی حکمت عملی قوم پرستانہ اور کانگریسی تھی۔^۱

معین عقیل زمیندار کے بارے میں رقمطراز ہیں :-

”زمیندار نے اپنے دور اجراء میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اولاً یہ سیاسی بیداری کسی واضح نصب العین کے لئے نہیں تھی لیکن اس سے آنیوالی سیاسی تحریکوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس میں طنزیہ اور سیاسی شاعری نے عروج پایا۔ اس کے ذریعے ہی مزاحیہ شذرات کی ابتداء ہوئی جس میں طنز و مزاح کے پیرایہ میں قومی اور ملکی مسائل کو نمایاں کیا جانے لگا۔ اس سے بڑے بڑے صحافی وابستہ رہے۔ ان میں عبداللہ انصاری، نصر اللہ خاں عزیز، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت، حاجی لعل وق وغیرہ ممتاز ہیں۔“

”مغرب عالم“ ۸ جون ۱۹۰۳ء کو مراد آباد سے جاری ہوا۔ اس کا تیسرا شمارہ ”مغرب عالم اور رحمت عالم“ کے نام سے شائع ہوا۔ اس اخبار نے انگریزوں کی سچی تبلیغ کی سخت مخالفت کی۔ اخبار ۲۰ اگست ۱۹۰۳ء کے شمارے میں لکھا ہے :-

”ریاست جے پور میں جہاں بہت دنوں سے عیسائی پادریوں کے قدم جمے ہوئے ہیں ان کے دشمن اسکول جاری ہیں۔ ایک عالیشان گرجا بنا ہوا ہے۔ عیسائی لیڈیاں گھر گھر تعلیم دیتی پھرتی ہیں۔ اور بڑی آزادی کے ساتھ عیسائی پادری وعظ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک ریاست کے سب بچے برہمن اور لیڈی ڈاکٹر برہمنی کو عام طور پر عیسائی بنایا گیا جس سے ہر طرف اس گروہ سے عام ناراضگی اور نفرت کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ ہندوؤں نے اپنے بچوں کو اسکولوں سے اٹھالیا مشینری لیڈیوں کا آنا جانا بند کر دیا ہے۔ عیسائی اسکول ویران پڑے ہیں۔“

۱۔ خورشید عبدالسلام صحافت پاکستان و ہند میں ص ۲۳۹۔ ۲۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۶۷۱۔
۳۔ ادب و صحافت، تاریخ صحافت اردو جلد چہارم ص ۲۳۸۔

”تحریک آزادی کے عظیم مجاہد، سیاست داں اور اعلیٰ پایے کے تخلیق کار، صحافی، فیصل الحسن حسرت موہانی کی ادارت میں رسالہ ”اُردوئے معلیٰ“ جولائی ۱۹۰۳ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اڑتالیس سے چونتھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس ادارہ میں اُردو کے نامور شعراء کے علاوہ ادبی، تاریخی، تنقیدی اور سیاسی مضامین بھی بڑی جیاکی سے لکھے جاتے تھے۔ حکومت پر اعتراضات کرنا اور مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت کی تلقین کرنا اس کا شعار تھا۔ یہ اخبار کیونٹنٹ پارٹی اور کانگریس کا حامی تھا۔ اور اس وقت وقوف پذیر ہونے والی تحریکوں میں حصہ لیتا تھا۔ ”اُردوئے معلیٰ“ کے فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں ایک مضمون سدیشی تحریک کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مضمون کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو۔

”سدیشی تحریک ایسی مفید اور مبارک تحریک ہے جس کے خدش کوئی ہوش مند اور ایماندار آدمی اپنی آواز بند نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے بعض دشمن بھی جو تمام ملکی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں اس تحریک سے اعلائیہ طور پر اخبار اختلاف کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔“

اس دور کے اخباروں میں ”ہندوستانی“ بھی قابل ذکر ہے۔ ہندوستان ۲۶ اگست ۱۹۰۳ء کو لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا۔ یہ اخبار انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔ جس دور میں ہندوستانیوں کو خوات کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور خاص کر افریقہ اور امریکہ میں ان کی بڑی تنہیک کی جاتی تھی ہندوستانی ان حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”ہندوستانی تمام ممالک یورپ، اور افریقہ سے کیوں نکالے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ تھوڑی مزدوری پر کام کر دیتے ہیں، تھوڑے داموں پر گزر کر سکتے ہیں، جو لات، گھونسہ اور گالیاں خوب کھا سکتے ہیں اور مضحکہ کر سکتے ہیں، غلاموں کی طرح فرمانبرداری کر سکتے ہیں جب دباؤ دب جاتے ہیں جو سناوہ سن لیتے ہیں اور چوں نہیں کرتے۔ ہندوستانی تمام ملکوں سے رفتہ رفتہ کیوں نکالے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ یورپین لوگوں سے ذہنی اور ارازاں ہوتے ہیں۔“

”ہندوستان“ میں لکھنؤ سے ہفتہ وار شائع ہوا، منشی دور کا پر سادہ افق لکھنوی س کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار سودیشی تحریک کا حامی تھا حکومت پر نکتہ چینی کرتا اور سخت مخالفت کرتا تھا۔ اس اخبار پر پابندی لگا دی گئی اور یہ جلد بند ہو گیا۔

”انڈیا“ گوجرانوالہ سے شائع ہوا، حق پرست اور میاں اخبار تھا۔ اس کے مدیر دینا ناتھ پر باغی ہونے کا الزام لگا کر پریس ضبط کر لیا گیا نیز مقدمہ چلائے گئے کیونکہ اس میں نفت خانی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی طرح ”آفتاب“ شائع میں ہفتہ وار نکلا شروع ہوا تھا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر سید حیدر رضا دہلوی تھے۔ اس میں حب وطنی سے بھرپور مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ڈیڑھ سال کے بعد بند ہو گیا۔ ”سوراجیہ“ شائع میں ”بارہ“ سے شائع ہوا تھا۔ یہ حریت پسند اخبار تھا بغاوت کی تلقین کرتا تھا۔ اس کے مدیر کو جیل بھیجا گیا اور اس طرح یہ بھی شائع میں بند ہو گیا۔ ہفتہ وار ”انقلاب“ شائع میں معرض وجود میں آیا۔ یہ بھی سودیشی تحریک کی حمایت میں لکھتا تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بعض اہم اخبارات کا جرمن میں آیا۔ اس زمانے کے صحافیوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور پر ذکر ہے۔ ابو سکلام آزاد ایک ہمہ جہت اور ہر گیسر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، محقق اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ وائل عمری سے مضمون نویسی میں شغف رکھتے تھے۔ اخبار مینی نے ان کے اس مذاق کو اور بھی جلد بخشی۔ اسی مذاق نے انہیں ایک کامیاب نثر نگار اور صحافی بنا دیا۔ اردو صحافت میں روز بروز ان کی دلچسپی بڑھتی گئی نتیجے کے طور پر مولانا نے ایک ادبی گلدستہ ”نیرنگ عالم“ کلکتہ سے جاری کیا۔ ”اصاح“ اور ”الندوہ“ کی ادارت کے ساتھ ”محرلن“ اور مختلف جرائد اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے۔ مولانا نے ”تحفہ محمدیہ“ اور ”غزنگ نظر“ کو بھی مرتب کیا۔ ”شائع“ میں ”لسان الصدق“ جاری کیا۔ ”دکین“ اور ”دار السلطنت“ کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔

صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اہم ترین کارنامہ ”البدل“ ہے۔ اس اخبار کا احسار ۱۲ جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا۔ یہ ہفتہ روزہ اخبار اردو ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں مذہبی سیاسی تاریخی ادبی، سوانحی مضامین نیز جغرافیہ سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۶ نومبر ۱۹۱۲ء

کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار روپے کی پہلی ضمانت ضبط کر لی۔ اس طرح ۱۴ اور ۱۵ اکتوبر کا مشترکہ شمارہ بھی ضبط کر لیا گیا اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸ نومبر کی اشاعت کے بعد "الہلال" بند ہو گیا۔ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو الہلال دوبارہ جاری ہوا، اور ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت کے بعد الہلال بالکل بند ہو گیا۔

ہندوستان ہی میں نہیں جنوبی افریقہ میں بھی انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم توڑے اور ذیل و خوار کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے۔ اور تھے تھے قانون نافذ کئے اسکے برخلاف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں نے جنوبی افریقہ میں ستیگرہ شروع کر دیا۔ ہندوستانی بخوشی گرفتار ہوئے اور ہندوستان میں بھی ستیگرہ کی حمایت کی گئی۔ ہندوستانی اخباروں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۶ نومبر ۱۹۱۳ء کے شمارے میں رقمطراز ہیں :-

"میرا مقصد جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے تازہ مصائب میں ہندوستانیوں کا کوئی جرم بجز اس کے نہیں کر وہ وہاں بس گئے ہیں، کاروبار کرتے ہیں اور چونکہ محنتی اور کفایت شعار ہیں اس لئے روپیہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مرفحہائی وہاں کی گوری آبادی کو کھٹکتی ہے اور پسند نہیں کرتی کہ ان کی سرزمین میں باہر کا کوئی آدمی روپیہ کمائے۔ اور بوجہ کم خرچ اور کفایت شعار ہونے کے ہندوستانی کم نفع پر مال فروخت کرتے ہیں بعض بازاروں میں گورے دکانداروں کو اس سے بھی نقصان ہوتا ہے یہ ان کی مزید برہمنی کا سبب ہے۔ انہوں نے اپنی گورنمنٹ کو آمادہ کیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستانیوں کو یہاں کے قیام سے روک دیا جائے۔"

امدادی صابری تاریخ صحافت اردو میں "الہلال" کے بارے میں لکھتے ہیں :-
 "مولانا کی ادارت میں الہلال نے ہندوستان کے عوام کو انگریزوں کی خلاف
 عید و جہد کی ہی دعوت نہیں دی تھی بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ انگریز سامراج کے
 خلاف ان کی جدوجہد تمام آزاد پسند اقوام کی جدوجہد کا ایک جزو ہے۔ اس
 طرح الہلال نے ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے ذہنی افق کو وسعت

بخشتی اور ان کے عزائم اور ارادوں کو پختگی دی :

تحریک آزادی ہند کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بڑی ہییت کا حامل ہے۔ وہ بچے بچہ آزادی اور محب وطن تھے۔ تحریک آزادی کی تبلیغ کے لئے نبوت نے ایک اخبار ”بہادر“ کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار ۲۳ فروری ۱۹۳۱ء کو کوہ چیلان دہلی سے ایک روزنامہ کی شکل میں جاری ہوا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کی فرمائش پر مولانا حالی نے ”بہادر“ کے موقع پر ایک رباعی بھی جس سے اس اخبار کی غرض و غایت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عزت کی تمنا نہ خطابوں کی طلب اک قوم کی خدمت کی ہے خوش یارب
بہادر کو اکسم با مسخ کیجور اس نام کی لڑتے ترے ہاتھ ہے اب
بہادر کی قالمیں ذرا کر حسین لہیر پری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود ہیں۔ ان قالموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء سے خزنک مولانا محمد علی آزادی وطن کے لئے کھتے رہے۔
۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کے شمارے یہ لکھتے ہیں :-

”آج کل مسلمانوں میں حریت اور آزادی کا بہت چرچا مہوم ہوتا ہے جو آوازیں پبلک میں سنائی دیتی ہیں وہ حریت کے زور میں بہہ رہی ہوتی ہیں اور جو مضامین پبلک میں قبولیت حاصل کرنے کے واسطے لکھے جاتے ہیں ان میں سوائے آزادی کے اگر کوئی دوسرا خیال نظر آتا ہے تو وہ لوگوں پر لعن لعن ہوتا ہے جن کو یہ حریت پسند اپنا مخالف خیال کرتے ہیں۔ حریت اور آزادی بیشک انسانی زندگی کے واسطے روح رواں کا حکم رکھتی ہیں اور جس قوم میں حریت اور آزادی کا مادہ باقی نہ رہے اس کے لئے موت زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔“

الہلال کے بند ہو جانے کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار البلاغ کلکتہ سے جاری کیا لیکن یہ بیک وقت دو شماروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پندرہ روزہ نکلتا تھا۔ اپریل ۱۹۳۱ء کو صوبہ بدر ہو جانے کی وجہ سے ۱۷ اور ۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء کے بعد ابلاغ بند ہو گیا۔ ابلاغ کی زبان بڑی صاف ستھری اور جامع ہوتی تھی۔ یہ اخبار بھی اپنے عہد کی یہی تحریکوں و رجحانات و کوائف کا

کا ترجمان تھا۔

مولانا محمد علی ہمیشہ کانگریس کے حامی رہے۔ انہوں نے ہندوستان کو تحریک آزادی میں شمولیت کی تلقین کی۔ ہمدرد کے ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

”بعض روشن خیال سیاست میں پارٹی میں شامل ہونے میں تامل ہے اور ان کی رائے ہے کہ کانگریس میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ اس میں داخل ہو کر سرگرمی کا اظہار کر سکیں۔“

ایک اور جگہ کا ذکر کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

”کانگریس کی کامیابی نہ تو ممبروں کی تعداد پر منحصر ہے اور نہ مختصر جماعتوں کے اتحاد پر اس کا انحصار ہے بلکہ اس کا انحصار طاقت پر جو وہ ہم میں پیدا کر دے۔ اس بات کا خیال دل میں لائے کہ ہندوستان کی تمام جماعتیں اور بیس کروڑ کے بیس کروڑ انسان کانگریس میں باہم متحد ہو جائیں۔“

اخبار ”غدر“ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو کیلی فورنیا سے جاری ہوا۔ یہ اردو، ہندی، مراٹھی اور گورکھی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر رام چند اور معاون ایڈیٹر برکت اللہ بھوپالی تھے۔ یہ ایک انقلابی ہفتہ وار اخبار تھا جو ہندی ایسوسی ایشن آف یوگ کاسٹ کا آرگن تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ ایسوسی ایشن سان فرانسسکو منتقل ہو گئی تو اخبار کا دفتر بھی منتقل ہو گیا۔ اس ایسوسی ایشن کا نام غدر پارٹی تھا۔ غدر پارٹی کے روح پرور وال اور اخبار غدر کے بانی لالہ ہر دیال تھے۔ یہ اخبار انگریزی حکومت کی شدت سے مخالفت کرتا تھا۔ عوام کو غدر پارٹی میں شامل ہونے اور تحریکوں میں حصہ لینے کی تلقین کرتا تھا۔ غدر پارٹی کے رضا کار اس کو عام سڑکوں اور بازاروں میں تقسیم کرتے نیز غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں کو ہندوستان آنے کی تلقین کرتے۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد جب انگریز ہندوستانیوں پر ظلم توڑ رہے تھے لیے دور میں اخبار ”غدر“ لکھتا ہے۔

”غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں تم فوراً ہندوستان آ جاؤ اور غدر پارٹی کے انگریزوں کو قتل کرو اور ان کو اس قدر خوت زدہ کر دو کہ وہ بھاگ جائیں اور اس طرح ان کو ملک سے نکال کر ہندوستان کو برطانوی لعنت سے نجات

دلاؤ۔ یہ بھی اور ٹھیک وقت بے غدر جانے کے لئے اپنے آپ کو منظرِ کرب کے
تیار ہو جاؤ۔ یسے میں جیک یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ تمام نہیں
دنیا بند کرو سارے ہندوستان میں غدر بچاؤ میں ایسے بہادر اور بہر فرزند
مجاہدین چاہئیں جو ہندوستان میں غدر بچاؤ کریں۔

اس دور کا ایک اور اہم اخبار ”بہم“ تھا۔ یہ اخبار کیم کتوبر ۱۹۱۸ء کو کھنڈر سے جاری ہوا۔
ایڈیٹر سید جالب دہلوی تھے۔ اس اخبار نے ایسے دور میں تحریک آزادی کی حریت میں آواز بلند کی
جب ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ انگریزوں کی طرف سے سخت قوت نافذ کئے جا رہے
تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر اخباروں کی ضمانتیں ضبط کر دی جاتیں تھیں۔ اس اخبار کی فائلوں کو دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خلافت تحریک سے متعلق زیادہ خبریں تاریخ ہوتی تھیں۔ اخبار ”بہم“ نے اپنی
تحریروں کے ذریعے تحریک آزادی کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل انگریزوں سے ہندوستان میں جو دھیسے کئے گئے پہلی جنگ عظیم کے
ختم ہونے کے بعد ان کو پورا نہیں کیا۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں کئے گئے ”رڈ ایکٹ“
جیسے قوانین نافذ کئے۔ اس دور کے ایک اور اخبار ”رمنہ“ نے رڈ ایکٹ کی سخت مخالفت کی۔ یہ
اخبار ۱۹۱۵ء میں جلد منسوخ ہو گیا۔ اس سے چند روزوں بعد شروع ہو گیا۔ اس کے
مدیر مسٹر اشفاق حسین صدیقی مراد آبادی تھے۔ اس میں سیاسی مضامین ہوتے تھے۔ انھوں نے پہلی جنگ عظیم
کے بعد انگریزوں کے مظالم کا ذکر اس کے مختلف شماروں میں مل جاتا ہے۔

اخبار ”پرتاپ“ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو لاہور سے جاری ہوا۔ یہ روزنامہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔
”پرتاپ“ کے ایڈیٹر مہاش کرشن چندر تھے۔ جب ”پرتاپ“ معرض وجود میں آیا اس وقت پنجاب میں
سیاسی بے مینی کا دور تھا۔ لہذا ”پرتاپ“ نے قومی نظریات کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ ۱۸ اپریل ۱۹۱۹ء
کو مہاش کرشن چندر کو گرفتار کر لیا گیا۔ مہاش کی گرفتاری کے بعد ”پرتاپ“ بند ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں مہاشہ جی
جیل سے واپس آئے تو ”پرتاپ“ بھی دوبارہ جاری ہو گیا۔

۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت کا آغاز ہوا اسی سال لاہور سے اخبار ”سیاست“ کا اجراء عمل
میں آیا۔ یہ اخبار سیاسی تحریکوں کا حامی تھا اس کے باغیانہ رویے کو دیکھتے ہوئے اخبار ”پرتاپ“ کا دیا

گیا۔ ایک غلط ترجمے کی سزا میں اس کے سب ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اخبار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی۔
 ۱۹۲۱ء میں اس کے بانی و ایڈیٹر مولانا حبیب اللہ نے تحریک خلافت میں حصہ لیا تو تحریک میں شمولیت کی پاداش میں انہیں بھی تین برس کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ اخبار ”سیاست“ کی تحریریں حق گوئی اور انصاف پسندی پر مبنی ہوتی تھیں۔ اسی لئے عوام اور خواص دونوں میں ”سیاست“ کو بہت مقبولیت ملی۔

۱۹۱۹ء میں اخبار ”کانگریس“ کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ اخبار کانگریس پارٹی کا ترجمان تھا۔ دہلی سے نکلتا تھا۔ اس کے مہتمم لالہ شکر تھے۔ یہ اخبار قومی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی بند ہو گیا۔

۱۲ اپریل ۱۹۲۳ء کو مہاشہ خوشحال چند کی زیر ادارت اخبار ”ملاپ“ کا اجراء ہوا۔ مہاشہ خوشحال چند نے ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور اپنی تحریروں کے ذریعے عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ ”ملاپ“ میں انگریزوں کے خلاف کارٹون وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔

روزنامہ ”الجمعیۃ“ مگلی قاسم جان دہلی سے ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار کے مدیر امسلی ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ اس کے علاوہ جن صحافیوں نے بحیثیت ایڈیٹر اس اخبار کی خدمت انجام دیں ان کے نام بالترتیب اس طرح ہیں۔ مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا عثمان فارقلیط اور ہلال احمد زبیری وغیرہ۔ الجمعیۃ میں مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کے مضامین ہوتے تھے۔ اس اخبار نے ملک کی سیاسی تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ اس دور کا ایک اور اخبار ہفتہ وار ”پیغام“ پشاور سے ۱۹۲۳ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر سید میر عالم شاہ ایک بلیاک اور نڈر صحافی تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی سناکانہ پالیسی کے خلاف قلم اٹھایا۔ اس اخبار کی پالیسی حکومت کے خلاف تھی۔ اس کی تحریریں بہت جذباتی ہوا کرتی تھیں اور ان میں انتہا پسندی پائی جاتی تھی۔ اس اخبار کی زندگی مختصر رہی۔ اس کے تین پرچے شائع ہوئے اور تینوں بحق سرکار ضبط کر لئے گئے نیز ایڈیٹر کو تین سال قید بامشقت کی سزا ملی۔

اس دور کے بعض اہم رسائل اور جرائد نے بھی آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ اگرچہ بعض رسائل بنیادی طور پر مذہبی اور ادبی تھے لیکن ملک کی سیاسی فضا کو مد نظر رکھتے ہوئے عوام کو ترجمان بن گئے اس دور کا ایک رسالہ ”منادی“ تھا۔ اس کے مدیر خواجہ حسن نظامی تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۲ء میں کوچہ چیلان

سے جاری ہوا "منادی" تصوف کی اساس پر جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے ایڈیٹر نے تحریک آزادی کے واقعات، حالات، اور کوائف پر بھی لکھا۔ معین عقیل اس زمانے کے رسائل کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"اس دور میں بعض اردو رسائل اور جرائد نے بھی سیاسی ماحول کے اثرات اخذ کر کے سیاسی رائے عائد کی ترجمانی کی۔ "ہمایوں" میاں بشیر نکالتے تھے۔ نیاز فتحپوری نے "نگار" کا اجرا کیا۔ حافظ محمد عالم نے "عالمگیر" نکالنا شروع کیا تھا حکیم یوسف حسن "نیرنگ" نکالتے تھے۔ "ادبی دنیا" شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" کا اجرا کیا۔ "ادب لطیف" لاہور سے جاری ہوا۔ قدیم رسائل میں معارف اور جامعہ باقاعدگی سے نکلتے تھے ترجمان القرآن مذہبی مقصد رکھتا تھا۔ لیکن اس نے سیاسی مباحث کو بھی اہمیت دی۔ اسے مولانا مودودی حیدر آباد دکن سے نکالتے تھے۔ یہ تمام رسائل اپنے عہد کے نمائندہ صحیفے تھے۔ ان میں ادب، فن، مذہب، تہذیب کے علاوہ سیاست پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔"

عقین صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔
 "ہندوستانی اخبار نویسی کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کا مزاج ابتدا ہی سے باغیانہ تھا۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان نے آزادی، ہنگامہ، اردو، ہندی اور انگریزی اخبار جاری کرنا شروع کئے۔ یہ سیدھے سادے معصوم سے اصلاحی اخبار ہوتے تھے۔ ان میں خبریں بھی شائع ہوتی تھیں مگر بظاہر غیر سیاسی قسم کی۔ ان کے انداز بیان اور مواد کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی گہرائی میں غم و غصے کے طوفان نظر آئیں گے۔"

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں اخبارات ایک موثر ذریعہ ابلاغ جمہوں نے براہ راست اور بالواسطہ طور پر عوام میں قومی شعور بیدار کیا۔ آزادی کی روح پھونکی اور عوام کو ملک گیر سطح پر بیدار کر کے اس تحریک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

لے تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۶۸۔ عہد عقین صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی، ۱۹۵۶ء ص ۵۹۔

اخبارات کے مدیر نڈر ہو کر بڑی بیباکی سے اپنے خیالات اور نظریات کو سپرد قلم کرتے رہے۔ اس مجرم کی پاداش میں اخباروں کی ضمانتیں ضبط کی گئیں۔ مدیروں کو قیدِ بامشقت کی سزائیں دی گئیں۔ اخبارات پر سنسر لگا دیئے گئے اور پریس ایکٹ کے تحت سخت سے سخت قانون نافذ کئے گئے۔ لیکن وہ اپنے ملک کی آزادی اور سلامتی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ ان اخبارات نے ہندوستانی عوام میں سیاسی بیداری پیدا کر کے حصولِ آزادی کی راہیں ہموار کر دیں۔





Dr. Zia ur Rehman Siddiqi is a young urdu Writer, Nationally known for his distinguished work in urdu research and criticism. He got his early education at Amroha (U.P.) and received higher education from Delhi University. He has been rendering yeoman's service to urdu since fifteen years. Jamia Millia Islamia New Delhi awarded him Ph.D degree in 1989.

Dr. Siddiqui has served in well reputed Universities such as Jamia Millia Islamia, Indira Gandhi National Open University, New Delhi and Punjab University, Chandigarh where he has taught Post Graduate Classes. He has been Post Doctoral Fellow of Indian Council of Historical Research New Delhi and also a UGC Fellow at Delhi University.

Presently, Dr. Siddiqui is a lecturer in Urdu Teaching and Research Centre, Govt. of India, Solan (H.P.). He is also a secretary of Anjuman Taraqqi e Urdu Hind branch Solan (H.P.)

Dr. Siddiqui is an eminent author and editor of numerous books and research papers published in India and abroad which include the following :

1. Hsuan-Tsang Ka Safar e Hundustan
2. Shehbaz Amrohvi - Fun Aur Shakhsiat
3. Maruzat
4. Iqbal Suhail Ka Fun
5. Tehrik e Azadi, Urdu Nasar Aur Muslim Udeba
6. Ahsan Danish - Intekhab e Kalam (In press)
7. 1857 Ke Akhbarat (In press)

(Publisher)